رابطہ ادبِ اسلامی (عالمی) کا

سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ ادب

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مرکزی دفتر رابطہ ادبِ اسلامی (عالمی) لکھنؤ

سہ ماہی کاروانِ ادب اسلامی

﴿مجلس مشاورت﴾

مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، لکھنؤ — مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ

پروفیسر محمد اجتباء ندوی، دہلی — پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ

مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب — پروفیسر ظہور احمد اظہر

ڈاکٹر محمود الحسن عارف — مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

﴿مدیر مسئول﴾

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

پروفیسر محسن عثمانی، C.I.E.F.L. حیدرآباد

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ

مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ

ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

﴿معاون انتظامی﴾

اقبال احمد ندوی

﴿معاون طباعت﴾

انیس احمد ندوی

﴿کمپوزنگ﴾

محمد نظام الدین ندوی

طباعت: کاکوری آفسیٹ پریس۔ لکھنؤ

زر تعاون

قیمت فی شمارہ :.................. ۴۰ روپے

سالانہ برائے ہندوستان:.................. ایک سو پچاس روپے

پاکستان و بنگلہ دیش:.................. ۳۰۰ روپے یا دس امریکی ڈالر

ان کے علاوہ دیگر ممالک :.................. چار سو روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں: RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۱۳	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء	شمارہ ۳

عناوین		صفحہ نمبر
منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۴

مقالات

النبی الخلق سیرت اور ادب وانشاء کی روشنی میں	مولانا عتیق الرحمٰن	۷
اردو زبان وادب کی تشکیل میں صوفیائے کرام کا حصہ	مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۱۷
مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی کی مثنویاں اور مسدس	مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی	۳۱
خواجہ حسن نظامی کی نثر	تابش مہدی	۳۶
مولانا شبلی کا ادبی پایہ	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	۴۲
علامہ شبلی نعمانی کی ادبی خدمات ندوۃ العلماء کے حوالے سے	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۵۶
اردو زبان وادب کے ارتقاء میں علامہ شبلی کا حصہ	ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	۷۶
خطبات آزاد کا صوتی رنگ	ڈاکٹر عبد الرشید ندوی	۸۷
اردو زبان وادب کے ارتقاء میں مولانا دریابادی کی صحافتی خدمات	حسین امین	۹۴
حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ اور خطابت میں ان کا مقام ومقصد	عمید الزماں کیرانوی	۹۹
الأستاذ المنفلوطی و خصائص کتابه "العبرات"	سید ازہر حسین ندوی	۱۱۲

شعر وادب

رابطۂ ادب اسلامی	حلیم صابر	۱۳۶

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

اسلام مکمل دین اور جامع نظام حیات ہے۔ اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید کو تا قیامت رہبر اور نگراں بنایا اور اس کے مضامین کی وضاحت اور نفاذ کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور رہنمائی کو نگراں بنایا۔ الحمدللہ شریعت اسلامی کے ان دو سرچشموں سے امت اسلامیہ کی اسلامی زندگی کو برابر رہنمائی ملتی رہی اور ان دونوں سرچشموں سے پوری طرح سیراب ہونے والے حضرات علماء دین کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان کے ذریعہ امت مسلمہ کے فرزندوں کو اپنے پروردگار کے احکام سے واقفیت حاصل کرنے کا برابر موقع ملتا رہا۔

دوسری طرف اسلامی زندگی کو جب جب خطرات پیش آئے تو علمائے حق نے ان کے مقابلہ کی کوشش کی۔ اس کا اندازہ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار پر نظر ڈالنے سے بخوبی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دین اسلام اپنی صحیح حالت میں برابر قائم ہے۔ اس میں کسی کی کوشش یا سازش سے تبدیلی نہیں آسکی۔ علماء امت کو بعض بعض زمانوں میں سخت چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور الحمدللہ وہ ان کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور علمی میدان میں نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے نظریات سے بھی

سابقہ پڑا اور علماء نے ان پہلوؤں میں بھی صلاحیت کا بڑا ثبوت دیا اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہے۔

گذشتہ صدیوں میں مغرب کے قوت وثروت کے لحاظ سے ترقی کر جانے پر اس کے غلبہ سے اسلامی ملکوں ونظریۂ حیات کو سخت خطرہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ وہ موقع تھا کہ دنیا کے مشرقی علاقوں میں جو اسلام اور امت اسلامیہ کی قوت وسطوت کا مرکزی مقام رہے ہیں، زندگی کے وسائل قوت وسطوت کے کمزور پڑ جانے پر مغرب کی استعماری طاقتوں نے اس کے ملکوں کے اقتصادی وسیاسی حالات میں دخل انداز ہوکر قبضہ جمالیا اور اپنے فکری اور غرض مندانہ مقاصد کے تحت ان ملکوں کے رجحانات واقدار میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کے لیے خاص طور پر اپنے تعلیمی نظام کے ذریعہ ذہنوں اور طبیعتوں پر اثر ڈالا۔ اسلامی قدروں کے لیے اس کے خطرات دیکھ کر علماء کرام نے قوم وملت کے دینی وملی تشخص کے بقا کے لیے توجہ صرف کرنے کی ضرورت محسوس کی اور دین کی حفاظت کے لیے علوم دین کی خصوصی تعلیم کا نظم کیا۔

غیر ملکی استعماری طاقت نے اسلامی ملکوں پر تسلط کے لیے دو محاذ اختیار کیے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنی عسکری طاقت اور معاشی حکمت عملی سے اقتدار وحکومت پر اختیار حاصل کیا۔ دوسرے یہ کہ ان ملکوں کی مسلم ملت کو اپنا اصل مدمقابل سمجھتے ہوئے اپنے اصحاب علم کے ذریعہ جو مستشرقین کہے جاتے ہیں، اسلام سے برگشتہ و بدگمان کرنے کا وطیرہ اپنایا۔ انہوں نے اپنے تعلیمی نظام اور فکری لٹریچر سے اسلام اور مسلمانوں کو علمی ودینی لحاظ سے پسماندہ اور ان کی مذہبی تعلیمات کو فرسودہ اور از کار رفتہ ثابت کرنے کی کوش کی۔ اس طرح اس امت کے ذہنوں کو بدل کر اپنے فکری خیال کا تابعدار بنانے کی کوشش کی۔ اس خطرہ کو ہمارے اس وقت کے علماء نے الحمدللہ محسوس کیا اور مقابلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف اپنی دینی تعلیمات کے سرچشموں کی پوری

حفاظت کا دینی مدارس قائم کر کے انتظام کیا اور دوسری طرف تحریکی اور عملی لحاظ سے ملک سے استعماری طاقتوں کے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کی۔ اس جدوجہد میں انہوں نے تعلیم وتصنیف اور تحریک کے ذریعہ ممکنہ کوششیں کیں۔ ان کوششوں میں ادبی کوششوں کا حصہ بھی نمایاں رہا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت صدیوں سے قائم تھی، ان کی سرکاری زبان فارسی اور ملک کے عوام کی رائج زبان مقامی ہندی تھی۔ علماء کرام نے دونوں کے آمیزہ سے اردو زبان ایجاد کی۔ اس کو شروع میں صوفیاء اور مصلحین امت نے عوام کو صحیح راہ پر چلنے کی تلقین کے لیے استعمال کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفاء ومریدین نے بھی بڑا حصہ لیا اور اس کے ذریعہ عامۃ المسلمین کو دینی اور اخلاقی طور پر بڑا فائدہ پہنچا۔ اس وقت کے شعراء نے اپنی شاعری سے بھی اس زبان کو مالامال کیا۔

ہم جب اس زبان اور اس کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے رواج وترقی میں مسلمان علماء وصوفیاء کا بڑا حصہ دیکھتے ہیں۔ شعری دائرہ میں بھی اور اصلاح وتربیت کے دائرہ میں بھی۔ انہوں نے دونوں دائروں میں خاصا کام انجام دیا۔

ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے اپنے سالانہ سمیناروں میں سے ایک سمینار ''اردو زبان وادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ'' کے موضوع پر رکھا تھا، اردو زبان کی آبیاری کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں چونکہ علماء اسلام و صوفیاء کرام کا نمایاں کردار رہا ہے، لہٰذا اس سمینار میں جو مضامین پڑھے گئے ان سے اس ملک میں علماء کے کردار کا بھی اچھا جائزہ ملتا ہے۔ ان مضامین میں سے اہم مضامین کو ''کاروان ادب'' کے اس شمارہ میں پیش کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس سے دلچسپی اور فائدہ محسوس کریں گے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
پٹنہ

مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم سیرت اور ادب وانشاء کی روشنی میں

مولانا سید مناظر احسن گیلانی (م:۱۹۵۶ء) ہندستان کے معروف عالم دین، اسلامی محقق اور دانش ور ہیں، جنھوں نے اپنی گراں قدر تصنیفات، نادر ونایاب افکار و خیالات اور بے مثل دینی تحقیقات کی بنا پر بیسویں صدی عیسوی کے علمی و دینی حلقوں میں ٹرا نام پیدا کیا ہے اور معاصر علما وفضلا کے درمیان اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔انہوں نے اسلامی وتاریخی موضوعات پر ''اسلامی معاشیات''، ''تدوین حدیث''، ''تدوین قرآن''، ''ابوذر غفاری'' اور ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی''، ''مجدد الف ثانی''، ''تذکرہ شاہ ولی اللہ''، ''سوانح قاسمی''، ''ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' کے عنوان سے کتابیں تصنیف کی ہیں، جو علمی و دینی وتاریخی لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔انہوں نے اپنی ان تصانیف میں حدیث وتفسیر، تاریخ وسیرت، فقہ وعلم کلام

اور تذکرہ کی امہات کتب سے استفادہ کر کے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ مصادر دینی کے مباحث پر غور وفکر کیا ہے، متقدمین ومتاخرین علما کے اقوال وبیانات پر بڑی سنجیدگی سے سوچا ہے اور اپنی خداداد دینی وعلمی صلاحیت علمی ودینی بصیرت اور گہری تاریخی واقفیت کی روشنی میں نہایت مدلل، معلومات افزا اور عالمانہ افکار وخیالات تحریر کیے ہیں، جنھیں پڑھ کر ہر طالب علم متاثر ہوتا ہے اور انکی بے مثل علمی ودینی صلاحیت وقابلیت کا قائل ہوجاتا ہے، اور انھیں نابغہ روزگار کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے سیکڑوں مقالات لکھے ہیں، جو علمی ودینی لحاظ سے اہم ہیں اور جن میں انہوں نے علم وفن کے موتی بکھیرے ہیں۔ یہ مقالات ہندستان کے اہم مجلوں میں شائع ہوئے ہیں، جو منطق وفلسفہ، تفسیر وحدیث، فقہ، علم کلام، معاشیات، تذکرہ، تاریخ، سیاسیات، تعلیم وتربیت اور تصوف جیسے اہم موضوعات پر ہیں، یہ مقالات بھی علمی ودینی اعتبار سے نہایت قابل قدر ہیں، اور قاری کے دامن کو معلومات کے خزانوں سے مالا مال کر دیتے ہیں، یہی نہیں بلکہ مولانا گیلانی کے مخصوص علمی ودینی تحقیقات ونظریات اور خوبصورت اسلوب بیان کی وجہ سے ان کی شخصیت کو ممتاز ترین مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ انہوں نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب تصنیف کی ہے، جو النبی الخاتم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سیرت نبوی پر ان کی نہایت معروف مگر مختصر کتاب ہے۔

دراصل یہ ایک مضمون ہے، جو امرتسر سے شائع ہونے والے جریدے ''ایمان'' کے لئے لکھا گیا تھا، جو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اب تک اس کے اَن گنت ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ جس سے پوری علمی دنیا فیضیاب ہورہی ہے۔

اس تصنیف سے قبل سیرت نبوی پر جو کتابیں ہمیں ملتی ہیں، وہ محدود عناوین کے تحت ہوتی ہیں، اور انہیں عنوانات کے تحت سیرت نبوی کے حالات و واقعات لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف جب ہم النبی الخاتم کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کی سب سے بڑی خوبی عنوانات و موضوعات کی کثرت ہی نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ کتاب نہایت مختصر ہے، جس میں صرف ۱۳۳ صفحات ہیں۔ اس کے باوجود اس میں ساڑھے چار سو عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ پھر یہ عنوانات بھی بلاوجہ یا غیر ضروری طور پر نہیں قائم کیے گئے ہیں۔ بلکہ تقریباً تین سو ایسے عنوانات ہیں جو جدید نظریات سے متعلق ہیں اور جن سے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، ان عنوات کے تحت صرف چند جملے لکھے گئے ہیں، لیکن ان مختصر جملوں میں سیرت نبوی کے جو حقائق و واقعات بطور ثبوت پیش کئے گئے ہیں، انہیں اگر پھیلایا جائے اور مزید تحقیق و تفتیش کی جائے تو ہر عنوان پر ایک مستقل تصنیف تیار ہو سکتی ہے، مولانا گیلانی کی وسعت مطالعہ اور جدید مسائل سیرت سے بھرپور واقفیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے سیرت پاک کے تمام پہلوؤں پر نہ صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ جدید اذہان نے اس سلسلہ میں جو نئے سولات اٹھائے ہیں ان کے جواب نہایت اختصار کے ساتھ پیش کر دئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی علمی و دینی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، اور یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ النبی الخاتم سیرت نبوی پر مثالی تصنیف ہے، جسکی مثال اردو زبان تو کیا عربی و فارسی میں بھی نہیں ملتی۔ یہاں چند عنوانات پیش خدمت ہیں جن سے مولانا کے تحقیقی مطالعے کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

زندہ نبی، مردہ مذاہب، ویدک دھرم، گاتھا کی تاریخی حیثیت، اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کا پتہ، تورات کا خاکستری نسخہ، بیت المقدس، اسلامی نام، انجیل کی تصحیح، منتر، گڑے مردوں کے دستخط، صحابہ کرام سے متعلق حضرت موسیٰ کی شہادت، زبور میں مکہ کا ذکر، لفظ محمد بائبل میں، بائبل میں آنحضرت کا ذکر کیوں محفوظ رہ گیا، آنحضرت کی زندگی میں وعدے سے پہلے توحید کی پہلی تجرباتی دلیل، اسماعیل کی وجہ تسمیہ، حضرت خدیجہ کی مشہور تاریخی رپورٹ، کوہ حرا سے اترنے کا ذکر سلیمان کی کتاب میں، دل کے تجربات کے منطقی ترتیب، ایجابی، شاہ حبش کی رقت، جمہوریہ قریش اور ان کے بین الاقوامی قوانین، جسمانی اور روحانی معراج کی بحث۔

اختصار و جامعیت

دنیا کی ہر زبان میں سیرت کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بے حساب مقالات تحریر کئے گئے ہیں۔ لاتعداد رسائل و مجلات شائع ہوئے ہیں، لیکن سیرت پاک کے بے پایاں ذخیرے میں گنتی کی چند کتابیں ہی ملیں گی، جن میں مختصر نویسی کو ملحوظ رکھا گیا ہو اور سیرت کے تمام پہلوؤں پر پوری جامعیت و اکملیت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہو۔ النبی الخاتم انہی چند کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

ہندستان کے معروف عالم دین مولانا محمد منظور نعمانی اس کی جامعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''الحمدللہ پیش نظر کتاب اس حیثیت سے انہی چند مستثنیات میں سے ہے، وہ اختصار کے باوجود ''سیرت نبویہ'' کے تمام قابل غور پہلوؤں پر حاوی ہے، بلکہ جن پہلوؤں کو دنیا نے قابل

غور نہیں سمجھا۔اور اس لئے ہمیشہ ان پر سرسری طور سے گزرا گیا، ان کو بھی اس کتاب میں ''قابل غور'' بنا کر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ان کا حق تھا۔اور بہت سے ان معلوم و مشہور واقعات نے جو ''حیات نبوی'' کے معمولی سوانح کی حیثیت سے لوگوں کے ذہنوں اور حافظوں میں محفوظ ہیں۔نہایت گہرے دوررس اور پھر بالکل صحیح نتائج نکالے ہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس خصوص میں یہ چھوٹی سی کتاب بالکل عام النظیر ہے''۔

وحی کی ضرورت واہمیت اور اسکی اطاعت وفرماں برداری پر سیرت نگاروں نے خوب خوب خامہ فرسائی کی ہے اور صفحات کے صفحات رنگ ڈالے ہیں لیکن مولانا گیلانی انہی باتوں کو اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔مولانا نعمانی فرماتے ہیں کہ ''جس نبی پر وحی کا نزول ہوا وہ بینا ہے اور جو لوگ اس عظیم دولت سے محروم ہیں وہ نابینا ہیں۔ایسی صورت میں نابیناؤں کے لئے اس کے علاوہ اور کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ بینا کی باتوں پر یقین کریں اور اسکے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، ورنہ گڑھوں اور کھائیوں میں گر جائیں گے''، اسی حیثیت کو مولانا گیلانی اپنے مخصوص ادیبانہ اور حکیمانہ لہجے میں نہایت اختصار کے ساتھ یوں بیان فرماتے ہیں:

''نابیناؤں کے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ بیناؤں کی سنیں۔ بخت کا چھوٹا وہ ہے جو خود بھی نہیں دیکھ سکتا، اور دیکھنے والوں نے جو دیکھا ہے یہ بدنصیب اس کے سننے سے بھی پیٹھ پھیرتا ہے، گردن موڑتا ہے، لیکن جانے سے پہلے کون مان سکتا ہے، جانو

تب مانو! پہچانو تب جھکو! یقین کی فطری راہ یہی ہے، تم آفتاب ہی کو نہ دیکھو! یہ تمہارے بس میں بھی ہے۔ سورج کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی شخص اپنی ایک پلک کو دوسری پلک سے جدا کر کے ٹکٹکی باندھ لے کیا اسکے قابو میں ہے کہ وہ آفتاب اور اسکی چمک کو جھٹلائے؟ آگ کے چھونے پر کوئی مجبور نہیں ہے، لیکن چھونے کے بعد گرمی کے ماننے سے کون گریز کر سکتا ہے۔"

عام فہم اور دلکش اسلوب

مولانا گیلانی کا اسلوب بیان نہایت دلکش اور خوبصورت ہوتا ہے۔ وہ زبان و بیان پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے دینی مسائل یا دینی موضوعات پر لکھنے کے لئے جب قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے اسلوب میں روانی، برجستگی، جاذبیت اور کشش پائی جاتی ہے۔ ہر جگہ آمد ہی آمد نظر آتی ہے۔ وہ ثقیل یا بوجھل الفاظ استعمال نہیں کرتے اور نہ بھاری بھرکم عبارتیں لکھتے ہیں۔ چونکہ وہ دار العلوم دیوبند کے بطل جلیل تھے، جہاں کی درسیات میں فلسفیانہ کتابیں شامل تھیں، اس کے علاوہ انہوں نے اس فن کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اس کے مسائل و مباحث میں غوطہ زنی کی تھی، اس لیے یہی اسلوب اور یہی فکر کی گہرائی ان کے دینی کتابوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب ہم النبی الخاتم کا مطالعہ کرتے ہیں اس میں بھی یہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں، عام فہم اور دلکش اسلوب کے ساتھ ساتھ مختصر، چھوٹے، اور عام فہم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، عربی و فارسی کے ثقیل اور بوجھل الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں جو بڑی خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں، کہیں کہیں خود ہی سوال کیا گیا ہے اور خود ہی جواب دیا

گیا ہے، تاکہ مسئلے کی اہمیت قاری کو معلوم ہو اور بہتر انداز میں تفہیم ہو سکے۔ چند اقتباسات آپ بھی دیکھیں:

''یوں آنے کو تو سب آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجیے کہ ان میں جو بھی آیا جانے کے لیے ہی آیا۔ ہر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے کے لیے ہی آیا، وہی جو اگنے کے بعد پھر کبھی نہ ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا ہی چاہئے کہ جنہیں کتاب دی گئی، اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کئے گئے، برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کس کو ہو سکتا ہے، جو پچھلوں میں بھی اس طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا، دور والے بھی اس کو ٹھیک اسی طرح پا رہے ہیں ہمیشہ پاتے رہیں گے جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے، اور ہمیشہ پہچانا جائیگا جس طرح کل پہچانا گیا تھا کہ اس کے اور صرف اس کے دن کے لئے رات نہیں بلکہ اس کا چراغ ہے جسکی روشنی بے داغ ہے۔''

کس درجہ حسین اور دل کش ہے یہ عبارت۔ منطقیانہ استدلال کا منطقی انداز ملاحظہ کیجئے۔ بات یہ کی جا رہی ہے کہ تمام مذاہب پر اسلام کو غلبہ حاصل ہے اسی حقیقت کو مولانا گیلانی اپنے مخصوص لہجے میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سچ یہ ہے کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے، اس میں اتنی تنگی یا پستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلے کے بغیر وہ اپنی زندگی گزارے۔ کہاں لے آیا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ جس چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جوابات نہیں ہیں، کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھا سکتا ہے، بہر حال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لا مذہبوں سے زیادہ بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ تعداد میں مذہبی لوگوں کی ہے اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے، کسی کو نہیں ہے۔ پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لا مذہبیت پر مذہب غالب، اور تمام مذاہب پر اسلام غالب، اس لئے سب پر اسلام غالب ہے۔"

اس کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لیے مذاہب عالم کی مقدس کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مولانا گیلانی کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، اسلامی موضوعات کے علاوہ یہودیت نصرانیت، ہندومت، سکھ مت، زرتشت مذہب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، ان کی تاریخی و علمی حیثیات پر بھی ان کی واقفیت بڑی اچھی تھی، بانیان مذاہب کے اقوال و ارشادات سے بھی بخوبی واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے النبی الخاتم لکھنی شروع کی تو آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اور نبوت کے سلسلے مین مذاہب عالم کا مطالعہ جا بجا پیش کیا، یہ مطالعہ بھی نہایت خوبصورت اور ادبی اسلوب بیان میں تحریر کیا گیا ہے، جس سے نہ صرف ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ

زبان و بیان پر قدرت اور ایک اچھے ادیب و انشا پرداز ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔اس سلسلے میں ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیں:

مولانا گیلانی ''مردہ مذہب'' کے تحت، وید دھرم اور اسکی تاریخی حیثیت پر اس طرح رقم طراز ہیں:

''جنھوں نے ناموں کو کھویا، کیا وہ اپنے ہادیوں کے کاموں کی نگہبانی کر سکتے تھے۔ہمارے ملک میں وید کی صورت میں اوتاروں کا کام پیش کیا جاتا ہے۔لیکن لا پرواؤ! تم سے جب ان کے ناموں کا بوجھ نہ اٹھایا گیا تو ہمیں کیا دکھاتے ہو کہ یہ ہے ان کے ناموں کا پشتارہ۔تاریخ کے تحقیقی ہاتھوں نے ہندستان کے رہنماؤں اور ان کی امتوں کے درمیان جو اندھیری کھائیاں کھود دی ہیں۔اور مسلسل کھدتی ہی جارہی ہیں، کیا اب آدمی کے بس میں ہے کہ ان کو پائے؟ کن پر اتری؟ کہاں اتری؟ کن کن زبانوں میں اتری؟ نظم میں اتری کہ نثر میں اتری؟ صدیوں میں اتری؟ جگوں میں اتری؟ جب ان تمام بنیادی سوالات پر، ایسے سوالات پر جن کی تحقیق کے بغیر کسی چیز کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ اٹکا ہوا ہے تم خود جانتے ہو کہ ان پر اندھیرا اور گپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، بتاؤ کہ شک کے ان دھرموں میں یقین کا قدم کس طرح اٹھایا جائے۔''

بہر حال یہ مناظر احسن گیلانی کی سب سے اہم تصنیف ہے۔سیرت نبوی کے موضوع پر مولانا گیلانی نے جس اختصار سے ساڑھے چار سو موضوعات کو بیان کیا ہے،

جدید مسائل کا احاطہ کیا ہے اور پھر ان کا عالمانہ جواب دیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ مولانا نے سیرت کے حالات وواقعات پیش کرنے کے لیے جو زبان و بیان، طرز نگارش اور دلکش اسلوب اپنایا ہے، اسے ایک اعلیٰ حیثیت حاصل ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں دینی کتابوں میں جب بھی نثر نگاری کے اعلیٰ نمونے ڈھونڈے جائیں گے یہ کتاب چند اہم کتابوں میں شمار کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

محمد خالد فیصل ندوی غازی پوری
(ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اردو زبان وادب کی تشکیل میں صوفیاء کرام کا حصہ

اہل اللہ صوفیاء کرام کو اللہ عزوجل نے بڑی قوت وتاثیر عطا فرمائی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے لئے کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے کرتے ہیں۔ وہ اخلاق وکردار کو سنوارتے بھی ہیں اور سیرت وصلاحیت کو مجلی و صیقل بھی کرتے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف باطنی نجاستوں سے پاکی کا سامان فراہم کرتے ہیں وہیں ظاہری دلکشی ورعنائی سے اغماض بھی نہیں برتتے۔ ان کا قلب مجلی ومصفی ہوتا ہے۔ ان کا باطن بے داغ ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کے دل سے قریب ہوتے ہیں اور دل تک پہونچنے کیلئے زبان ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے وہ عوام کی زبان سے بھی قریب ہوتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ان کے وجود پر چھا جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امراء بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے بھی وہ کام نہیں ہوسکتا جو

فقیر اور درویش کر گزرتے ہیں، بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر کا دربار عام ہے۔ جہاں بڑے وچھوٹے، امیر وغریب، عالم وجاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان ومال کا مالک ہوتا ہے لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا اثر محسوس ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت واقتدار حاصل ہوجاتا ہے کہ بڑے بڑے جبار اور باجبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ دل ان کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں، وہ دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لئے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اصفیاء نے ہندوستان کی سرزمین پر دور دراز خطوں سے، سر بفلک پہاڑوں کو طے کرتے ہوئے ریگستانوں اور مرغزاروں سے گزرتے ہوئے جہاں کہیں بھی ہندوستان کے طول وعرض میں طرح اقامت ڈالی تو انہیں وہاں کی عام زبان میں کلام کرنے میں کوئی توحش نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ وہ وہاں کی تہذیب وثقافت اور زبان کو بھی کوثر وتسنیم سے دھوکر پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اسی طرح ان کی آمد ناز اور کوششوں کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب، ایک نئی ثقافت کی جہاں داغ بیل پڑی وہیں ایک نئی زبان کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع بہم پہونچا۔

اصفیاء کی مجلسوں نے اردو زبان وادب کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اس لئے کہ ان کی مجلس عام ہوتی ہیں، انکی خانقاہوں میں امیر وغریب سبھی بار پاتے ہیں، خواص سے زیادہ عوام انکی طرف جھکتے اور انکی زیارت وصحبت کو موجب برکت سمجھتے، یہی وجہ ہے کہ تلقین کے لئے انہوں نے جہاں اور طریقے اختیار کئے ان میں

سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تا کہ اپنا پیغام عوام تک پہونچا سکیں۔ چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے خواص کو چھوڑ کر عوام سے انہی کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے۔اس طرح ایک نئی زبان کا قالب تیار ہوا۔

شیخ حمیدالدین ناگوری

خزانۂ رحمت میں لکھا ہے کہ ایک روز شیخ حمیدالدین ناگوری (ولادت ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء اور سن وفات ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء) فقر وفاقہ سے تنگ آکر اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اپنے فرزند کی حق میں فراخیٔ معاش کی دعا فرمادیں، انہوں نے فرمایا کہ ماں اپنے فرزند کے حق میں فراخی معاش نہیں چاہتی اگر تم فراخی معاش چاہتے ہو تو اپنے باپ سے کہو چنانچہ یہ باپ کے خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی عرض کیا، والد نے فرمایا، ہاں بابا کچھ کچھ، انہوں نے ماں کے پاس حاضر ہو کر کہا کہ حضرت والد نے یہ فرمایا ہے۔ والدہ نے کہا بابا تم اپنا گھر الگ بنالو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے اتنی دولت آئیگی کہ ہمیٹتے نہ بنے گی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے گھروں میں بھی اس زمانے میں ہندی بول چال شروع ہوگئی تھی اور ''ہاں بابا کچھ کچھ'' سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ زبان جسے ہندی کہتے تھے اور جو باوجود تغیر وتبدل کے کچھ مدت قبل تک ہندی کہلاتی رہی ہے اور اب اردو کے نام سے موسوم ہے اس کی داغ بیل انہیں اصفیاء کی مرہون منت ہے۔

امیر خسرو

سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین (ولادت ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء، وفات ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ھ) سلسلۂ چشتیہ میں عجب صاحب کمال، وسیع المشرب، صاحب دل اور صاحب ذوق بزرگ گذرے ہیں، ہر ملت ومشرب کے لوگ انکے یہاں حاضر ہوتے اور انکے عرفان سے فیض پاتے۔ امیر خسرو کو بھی سلطان الاولیاء ہی کے دربار سے فیض پہونچا تھا، وہ انکے خاص مریدوں میں سے تھے اور اکثر انکے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے، انکے بارے میں صاحب گل رعنا رقم طراز ہیں:

> ''امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صفت و ایجاد رکھتی تھی ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشاء پردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا، مکرتی، انمل، دوسخنی قسم قسم کے گیت اور پہیلیاں خاص انکے آئینۂ کمال کا جوہر ہیں۔ خالق باری کو بھی انہی کے طبع رسا کا نتیجہ سمجھو۔ اس حیثیت سے اس کو اردو نظم کی داغ بیل قرار دینا ایک حد تک ٹھیک ہے..... (گل رعنا از مقدمہ ص ۶/)

امیر خسرو نے موسیقی میں جو مہارت دکھائی ہے، فارسی اور ہندی موسیقی کو ملایا ہے۔ اور زیادہ تر غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندی نظمیں اور دوہے لکھے افسوس انکا ہندی کلام دستیاب نہیں۔ تذکروں میں کہیں کہیں بعض چیزیں مل جاتی ہیں۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں انکا یہ قطعہ لکھا ہے۔

زر گرپسر ہے چوں ماہ پارا
کچھ گھڑیئے ، سنواریئے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

حقیقت میں ریختہ اس کا نام ہے، جس میں فارسی ہندی دونوں ملی ہوئی ہیں اور یہیں سے اردو کی ابتدا ہوتی ہے۔(اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاء کا کام۔ص/۱۶)

ایک مشہور غزل ریختے کی انکے نام سے تذکروں میں ملتی ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

زحال مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلش چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکا یک از دل دوچشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بحق روز و صال دلبر کے داد مارا فریب خسرو
پسیت بن کے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

صاحب گل رعنا کے مذکورہ بالا اقتباس سے بھی تأثر ملتا ہے کہ جس شخص نے اس زبان میں شاعری کی داغ بیل ڈالی وہ حضرت امیر خسرو ہیں۔لیکن اسکی ابتدا اور نشو ونما میں کچھ اور بھی افراد ہیں جنکا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔ ہندی ادبیات مطبوعہ خدا بخش لائبریری کے صفحہ ۲/ پر اس سلسلہ میں جو کچھ مذکور ہے وہ بھی قابل غور ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے پیرہن کی تراش وخراش کچھ اور پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔

تمام تذکرے متفق الالفاظ ہیں کہ مسعود سعد سلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر گذرا ہے۔مسلمانوں میں سب سے پہلے اس نے بھاشا زبان شروع کی اور یہ قصہ حضرت امیر خسرو سے دوسو برس پہلے کا ہے، مسعود سعد سلمان کے بابت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندی میں ایک دیوان لکھا تھا۔تذکرہ مجمع الفصحاء کی عبارت شاہد ہے۔

''الحاصل وے راسہ دیوان رتازی، ہندی، فارسی''

الغرض مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے دیوان ناپید ہو گئے۔لیکن ان کے درمیانی دور کے بزرگوں کے دیسی بھاشاؤں میں مہارت کے کافی شواہد ملتے ہیں۔ حضرت فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر (ولادت ۵۷۵ھ۔ وفات ۶۶۷ھ)۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی متوفی ۱۴/ربیع الاول ۶۳۲ھ کے مرید اور سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء، متوفی ۷۲۴ھ کے پیر ومرشد تھے۔ بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں ان کے اشعار پنجابی، ہندی اور فارسی میں ملتے ہیں۔سکھوں کی مقدس

کتاب سری گرو گرنتھ صاحب بابا فرید کے ۱۳۰ راشلوک اور چار شبد پائے جاتے ہیں جو بابا نانک کے ہم عصر شیخ ابراہیم کے ذریعہ دستیاب ہوئے تھے۔ قدیم بیاضوں نے بھی متفرق اشعار، مقولے، بانیاں، کافیاں، اذکار ہندوی ملتے ہیں۔ مخلوط زبان میں آپ کی ایک غزل جس کا مقطع یہ ہے۔

پند شکر گنج زدل و جاں شنو ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

چند دوسرے مصرعے یہ ہیں۔

بحر خداوند چہ سوغات ہے نیک عمل کن کہ وے سات ہے

حضرت غوث گوالیاری نے جواہر خمسہ میں ان کے ہندی اذکار کو نقل کیا ہے۔ کچھ برجستہ مقولے بھی آپکے ہم تک پہونچے ہیں۔ صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں..... بابا فرید الدینؒ نے شیخ جمال الدین ہانسوی کے بیٹے مولانا برہان الدین صوفی کو صغر سنی میں مصلاً عطا کیا۔ مادر موموناں یعنی خادمہ شیخ ہانسوی سے عرض داشت بزبان ہندوی خوجہ بالا ہے۔ اس پر حضرت بابا نے ''فرمود بزبان ہندوی''، پونوں کا چاند بالا ہے۔ یعنی ماہ شب چہاردہم دراول۔ خوردی باشد کہ بتدریج بکمال رسد، ان فقروں میں ''ہے'' کا لفظ خاص کر جاذب توجہ ہے۔ اس لئے پراکرتی بھاشاؤں میں اس وقت اس کا وجود نہیں تھا۔

بابا فرید سے چار صفحہ کا ایک رسالہ بھی منسوب ہے جس میں یہ عبارت ملتی ہے۔

''جلی یاد کی کرنا، ہر گھڑی یک تل حضور سون ٹلنا نہیں،

اٹھ بیٹھ بن پارسوں شادر ہنا، گواہ دار کو چھوڑ جلنا نہیں، پاک رکھ
تون دلی کو غیر ستے، آج سائیں فرید کا آرتا ہے' قدیم قدیمی کے
آرتے سین لازوال دولت کون پاڑتا ہے''۔

بزرگوں کے ملفوظات و مکاتب جو کل فارسی زبان میں مسائل تصوف اذکار و اشغال، توحید و معرفت سے مملو رہتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی لسانی خصوصیات وخدمات کے متعلق جو کچھ بھی تھوڑی روشنی ڈالتے ہیں، وہ بہت قابل قدر درخور اعتناء ہیں۔ خال خال اشاروں، الفاظ، مقولوں سے مترشح ہوتا ہے کہ فارسی کے علاوہ خطے کی زبان بھی یہ سمجھتے اور بولتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں ہندی کا رواج ہو چلا تھا۔

بہار کے مشہور ۱۵ رصدی عیسوی کے بزرگ حضرت ابوالفیض علاء قاضی شطاری نے اپنی نادرالوجود کتاب معدن الاسرار میں ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت جلال الحق والدین یعنی سید جلال بخاری قدس سرہ نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں بزبان ہندی فرمودند، والحق راست گفتہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستان گیر صاف زبان کی داغ بیل چودھویں صدی کے قبل ہی پڑ چکی تھی اور بزرگوں کا ریختہ یا اردو کی تدریجی ارتقاء میں بڑا ہاتھ تھا۔

امیر خسرو کے ہم عصر بلکہ قدرے متاخر بہار کے وہ جلیل القدر صوفی بزرگ حضرت شرف الدین یحیٰ منیری ولادت ۶۶۱ھ۔ وفات ۷۸۲ھ اور آپ کے اجل خلفاء و مرید حضرت مظفر شمس بلخی متوفی ۷۹۷ھ ہندوستانی نژاد تھے۔ اس لئے ہندوستانی بھاشا سے خوب واقف تھے، اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ مکتوبات مظفر

بلخی ایک ضخیم کتاب ہے، جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی، مکتوب ۱۲۱ کا موضوع ہے۔

ہر کہ زیستن نداند مردن ہم نداند
ہرکہ زیستن نداند مردن کے داند

اسی میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''وقتیکہ کمانچی پیش بندگی مخدوم جہاں (شرف الدین احمد بہاری) کمانچہ میز دوایں دوہرہ گفت''۔

''ایکت لندی بھیدا بہوتر بہر کہ کائن نتامیں اینجہا مرن، تہتی نہائن، مخدوم راسخت گرفت بود، آبدیدہ کردند'' حضرت کا اس دوہے سے اس قدر متاثر ہونا کہ آنسو ٹپک پڑے، بہت معنی خیز ہے۔

مکتوب ص ۱۷۳ در بیان آنکہ صوفی کرا گویند وانتقام کشیدن بانفس کافر، اس دوہرے سے شروع ہوتا ہے۔

آمی کون تن پنکہیر وا جنگل کہ من اوداس
کنکر چنہ چل بنہہ دھنی نہ چھوؤ نہ باس
جیٹھ اساڑھ نہ آئیتا پاتان بہر ہربانہہ
تی بہیری بسار دھن تہکی جل تھل نانہہ

معنی مفہوم ان اشعار کے بخوبی ظاہر نہیں ہوتے، شاید ان میں جوگ کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔ خانۂ روح کا دستہ بھیگ رہا ہے لیکن بوندیں دوسری جگہ یعنی

موسلا دھار چکر پر پڑ رہی ہیں۔ مٹ جوگ کے مطابق ہر سمندر میں جو چاند ہے اس سے امرت برستا ہے لیکن اسکا استعمال غلط ہو رہا ہے۔ وہ موسلا دھار کے سورج پر گرتا ہے اور سوکھ جاتا ہے یعنی بیکار ہو جاتا ہے۔ روح کو اسکا فائدہ نہیں ہوتا۔

دور اولین کے ہندو و مسلمان کی لسانی مماثلت، خیالات و احساسات کی ہم آہنگی اور امتزاج سے ہندوستان میں جو ایک نئی زندگی، نئی ثقافت پیدا ہوئی اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ مقالہ نہ اس کا متحمل ہے۔ اور نہ اس کی ضرورت۔ یہاں تو محض ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنا مقصود ہے کہ صوفیاء نے زبان کو کس طرح مالا مال کیا اور اسکی تدریجی ارتقاء میں اسکی کیا اہمیت ہے۔

اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد یعقوب عامر نے اردو ادب کے ابتدائی ادبی معرکہ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ''اس میں کوئی شک نہیں کہ خانقاہوں اور فقر و درویشی کے گہوارے میں ہندوستان کے اندر جس زبان کی تربیت ہوئی وہ اردو ہی تھی۔ علمائے دین اور صوفیائے کرام نے اس زبان کی نشو و نما میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ دکنی اردو کا شعر و ادب زیادہ انہیں صوفی شعراء کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ شمالی ہند میں دلی اور لکھنؤ کے اندر اور خانقاہوں کے زیر نگرانی اس کی ساخت و پرداخت ہوئی۔ دبستان دلی میں خواجہ میر درد کا نام اس نسبت سے ہمیشہ تعظیم و تکریم کے ساتھ لیا جائیگا کہ لکھنؤ میں بھی اس قسم کے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ مصنف شاہ ملوک کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔ والحق درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رود۔ بسبب نام، لہذا اس کا اثر زبان پر بھی ہوا ہے، لیکن زبان بنتی ہے بنائی نہیں جاتی، اور ابتدائی دور میں ہندی

محاورات، تشبیہات اور جملوں کی ساخت میں ہندی خیالات واحساسات، طور طریقہ رسم وعادات کا پرتو پڑنا ضروری تھا، اور پڑا۔ ایسی مثالیں بہت اہم سمجھی جاسکتی ہیں۔

علامہ محمود شیروانی اپنے مقالہ اورنیٹل کالج میگزین لاہور میں ایسی بہت سی باتیں لکھ کر فرماتے ہیں۔ ناک میں دم آنا، چراغ لے کر ڈھونڈنا، خالہ کا گھر، ہاتھیوں سے گنے کھانا، سب کو ایک لاٹھی ہانکنا اور بیڑا اٹھانا وغیرہ کے استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بزرگ (امیر خسرو، برنی عفیف) اس زبان سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ آگے رقمطراز ہیں:

> ''وثوق کے ساتھ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان جماعت کی زبان قطعا بدل چکی تھی اور اس زبان کا اقتدار اس حد تک قائم ہو چکا تھا کہ عوام ان میں درکنار امراء وشرفاء تک کے نام وعرف ہندی ہونے لگے تھے۔ مثلا ملک چھجو، ملک جونا، ملک بھٹا، ملک فخر الدین کھنڈ اور بی بی رانی وغیرہ''۔

شیخ قطبین اتر پردیش کے اضلاع میں کسی جگہ کے رہنے والے تھے۔ زبان اودھی یا پوربی ہندی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں عربی، فارسی الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔ صرف نحو وافعال کی ترکیب بھی غیر ملکی زبانوں کے نہج پر نہیں ڈالی۔ ان کے کلام میں پرکرتی ہندی کی مابہ الامتیاز خصوصیات، شرنگار عشق، دہر شجاع، بیراگ (فراق) حسن وشباب کی کیف آفریں اور وجد افزا باتیں بھی موجود ہیں۔ ان کو آج سے پانچ چھ سو سال پہلے کے کلام میں غریب اور نامانوس عبارات کا ملنا باعث حیرت

نہیں لیکن سادہ اور عام فہم ٹکڑے درخور اعتناء ہیں۔ مثلا

پوچھئے سبھا کہدنوں مورا، گھر کہیواں تورا
کہیواں ایسی تری تین پانی، کا کرہی ہے کہیواں جائی
چاند ساتھ بھئی اوسدھ بھوا، جہیز نگر سبھا منھ گوا

لسانی تحقیق کے شائقین کے لئے کیا یہ اجزاء دعوت غور و فکر نہیں دیتے، کھڑی بولی، ہندوستانی ہندی، اردو کی تخلیق و تولید، تعمیر و ارتقاء، ترویج پہ کیا ان سے کچھ روشنی نہیں پڑتی؟

مولانا عبدالحق بابائے اردو کا ایک رسالہ ''اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام'' عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے لیکن اس میں زیادہ تر دکنی اور گجراتی بزرگوں کے متفرق مقولے اور ان کی ہندی تصنیفات کا ذکر ہے۔ مولانا موصوف نے کتاب کے آخر میں یہ تحریر فرمایا ہے:

''آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ قدماء کے اقوال جو کسی خاص سوال کے جواب میں یا معمولی گفتگو میں آئے ہیں وہ خالص ہندی میں ہیں۔ ان میں شاذ و نادر فارسی عربی لفظ نظر آتے ہیں۔ ابتدائی کلام بھی سادہ ہندی ہے۔ خصوصا جو صوفی سماع کا ذوق رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ ہندی دوہے اور خیال وغیرہ اسی زبان میں کہتے تھے، لیکن ان میں بھی کبھی کبھی اپنے یہاں کے عارفانہ الفاظ داخل کر دیتے تھے۔ جب انہیں اپنے مریدوں اور معتقدوں کی ہدایت کے لئے نظم و نثر میں رسالے لکھنے کی ضرورت پڑی یا معرفت و

سلوک میں سوالات کے جوابات لکھنے پڑے تو وہ اپنے مذہبی اصطلاحات ہندی تصوف کے الفاظ کے ساتھ ساتھ بے تکلف استعمال کرنے لگے، یہاں تک کہ حمد ونعت میں بھی عربی کے الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے مذہبی لفظ بے ساختہ لکھ گئے ہیں۔

اس رواداری سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان کی ہدایت عام ہو۔ جس طرح انہوں نے ملک کے حالات کے لحاظ سے بعض ظاہری قیود کو توڑ کر اہل ملک سے ارتباط اور میل جول بڑھانے اور انکو اپنی طرف مائل کرنیکی کوشش کی، اسی نظر سے انہوں نے ان کی اور اپنی زبانوں کو بھی ملانا شروع کیا۔ ان کی نظموں کی بحریں اکثر و بیشتر ہندی ہیں، طرز بھی نظموں کا ہندی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہندی دیومالا کی تلمیحیں اور استعارے بھی استعمال کر جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ اپنی چیزوں کو بھی ملائے جاتے ہیں۔ ہوتے ہوتے اس میل وارتباط سے خود بخود ایک نئی زبان بن گئی جو نہ ہندی تھی نہ فارسی، بلکہ ایک نئی مخلوط زبان تھی جسے ہم اب اردو یا ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہندی یا اس نومولود زبان میں لکھنا اہل علم اپنے لئے باعث عار سمجھتے تھے، اور وہ اپنی عالمانہ تصانیف کو اس حقیر اور بازاری زبان کے استعمال سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ صوفیاء ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے جرأت کی اور اس کفر کو توڑا۔ اصل صوفی

ظاہری ننگ و عار سے بالا ہوتا ہے اور اس نے پھر ایک بار دکھا دیا کہ حقیر سے حقیر چیز سے بھی کیسے کیسے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ یہ صوفیوں ہی کی جرأت کا فیض تھا کہ انکی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی جو پہلے ہچکچاتے تھے اس کا استعمال شعر و سخن، مذہب و تعلیم اور علم و حکمت کے اغراض کے لئے شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان صوفیائے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔

یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب و شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی نہ اس کا انہیں کچھ خیال تھا۔ انکی غایت ہدایت تھی کہ اس ضمن میں خود بخود اس زبان کا فروغ ہوتا گیا۔ اور عہد بہ عہد نئے اضافے اور اصلاحیں ہوتی گئیں اور انکی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی۔ جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہوگئی۔ گو یہ اب تک بھولی بسری داستان ہے، لیکن اردو زبان کا مؤرخ انکے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا"۔ (اردو زبان کی ابتدائی نشونما میں صوفیاء کا کام۔ ص/۸۱)

☆☆☆☆☆
☆☆☆

سید محمود حسن حسنی ندوی
رائے بریلی

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی کی مثنویاں اور مسدس

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی ایک نامور مصنف محقق مؤرخ عالم و مربی گزرے ہیں۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اصلاح و دعوت و جہاد کے اثرات ان پر بھی پڑے۔ مولانا، سید محمد ظاہر خلیفہ حضرت سید احمد شہید کے پروردہ اور نواسے تھے۔ چونکہ والد مولانا سید عبدالعلی حسنی کا ناگور میں کم عمری میں انتقال ہوگیا تھا، نانا نے سرپرستی و تربیت کی۔[1] وہ فارسی، اردو اور خاص طور پر بھاشا کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ اس کے اثرات ان پر بھی پڑے۔ اپنی ان صلاحیتوں سے جو زبان و بیان کی انھیں عطا ہوئی تھیں، معاشرہ کی اصلاح اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کا کام لیا۔ حالی نے مسدس لکھی، یہی زمانہ ہے کہ انہوں نے بھی مسدس لکھی ان کا تخلص خیالی تھا۔ مسدس خیالی کا اپنا الگ رنگ ہے، جس میں انہوں نے حالی کے نظریے کی اصلاح کی ہے۔ حالی نے بر

۱۔ نانا مولانا سید محمد ظاہر صاحب نے آپ کو اجازت بیعت و ارشاد سے بھی سرفراز کیا۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے چچا مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی سے اصلاحی و تربیتی تعلق قائم کیا اور ان سے بھی خلافت پائی۔

ٹش حکومت کا پاس ولحاظ رکھا ہے اور اپنی شاعری میں ایسی کسی بات کے کہنے سے گریز کیا ہے، جس سے برطانوی حکومت پر ضرب پڑ رہی ہو، یا ان کے مفادات متاثر ہو رہے ہوں۔ ان کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا کہ ایسا نہ کرنے کا غلط انجام بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً حالی یہ کہہ گئے ہیں:

نہ بد خواہ ہے دین و ایماں کا کوئی　　نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی　　نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں

خیالی، حالی کی اس مصلحت پسندی سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ خیالی نے اپنی مسدس میں مسلمانوں کو دعوت فکر و عمل دی ہے اور مسلمانوں کی نصرت و کامیابی کا راز بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

خوشی اور غمی میں تھا ان کی زباں پر　　کلام خدا اور حدیث پیمبر
اسی کے تھے عالم اسی کے ہنرور　　اسی پر عمل کرتے تھے وہ سراسر
یہی فتح و نصرت کا ان کے سبب تھا
نہ ان میں حسد تھا نہ فخر نسب کا

یہ دونوں مسدس اس وقت میں سامنے آئیں، جب ملک پر برطانوی اقتدار کا غلبہ تھا۔ بہر حال حالی نے اپنا کام کیا، جس کے مناسب اور غیر مناسب اثرات و نتائج سامنے آئے تھے۔ خیالی نے غیر مناسب اثرات کو زائل کرنے کے لئے اپنا کام کیا حالات کے اعتبار سے دونوں کا کام قابل قدر ہے۔

خیالی کی مسدس پر ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی نے اپنے مقالے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے:

''مسدس خیالی۔ لکھنے کا محرک حقیقتاً انگریز دشمنی اور وہ مجاہدانہ جذبہ اور حمیت دینی تھا جو انھیں اپنے خاندانی بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔''

یہ مسدس ایک صفحہ کے مقدمہ اور ۲۵۴ بندوں پر مشتمل ہے، کتاب اپنی جگہ پر جاندار ہے، مسدس کا کوئی بند ایسا نہیں ہے جس میں بندش الفاظ، روانی اور زور میں کمی ہو، لیکن مضمون فضا اور ماحول کا ہم مزاج نہ بن سکا، اس لئے شہرت و مقبولیت سے محروم رہا۔[1]

خیالی کی مثنویوں سے متعلق جناب خلیق احمد نظامی کا یہ تاثر بجا ہے کہ:

''خیالی کے شاعرانہ کمالات کی آئینہ دار ان کی مثنویاں ہیں۔ ان کا فکری پس منظر، خاندانی روایات، اور شاعرانہ شگفتہ مزاجی فوراً مومنؔ کی تصویر ذہن میں اجاگر کر دیتی ہے، وہی مومنؔ جو شاعر کی حیثیت سے کوچۂ رقیب میں سر کے بل چلنے کو تیار رہتا تھا۔ سید احمد شہیدؒ کے ساتھ جہاد میں شہادت کی حسرت رکھتا تھا اور ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب

کی دعا مانگتا تھا۔ خیالی جب شاعری کے میدان میں قدم رکھتے تھے تو سوز و گداز اور حسن و جمال کی نزاکتوں کا پورا احساس ان کا ہم عنان ہوتا تھا''۔

مولانا خیالی فارسی، اردو اور بھاشا کے شاعر تھے۔ بھاشا میں ''پریم راگ'' ان کا

۱۔ مولانا کلیم سید عبدالحی حسنی ''گل رعنا'' میں مسدس خیالی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''مسدس خیالی، مسدس حالی کے جواب میں مولوی عبدالعلی مدراسی نے لکھوائی تھی اور انہی نے اس کو چھاپ دیا ہے۔'' ص ۵۳۶ دار المصنفین اعظم گڑھ

دیوان ہے۔ فارسی میں بھی دیوان ہے۔ اردو کا دیوان ''جوش دل'' کے نام سے تھا۔ یہ ان کا اردو کا پہلا دیوان تھا، جو ضائع ہو گیا۔ انہوں نے اردو کے تین دیوان لکھے۔ دیوان خیالی، اردو کا تیسرا دیوان تھا، جو بھوپال میں ترتیب دیا گیا تھا۔ ''دیوان فخر'' ان کا دوسرا دیوان تھا۔ یہ دیوان مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے پاس محفوظ تھا۔ ان کے بقول: اس میں چند قصیدے، غزلوں کا دیوان، مسدس اور رباعیاں ہیں۔ ان کی مثنویاں بہار تسلیم، جان فخر اور فغان فخر ہیں، جو لکھنو یا رائے بریلی میں انہوں نے لکھیں یہ محفوظ رہیں اور ان کے مسودے ان کے فرزند و جانشین مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے پاس محفوظ تھیں۔ جس کے منتخب اشعار انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ شعرائے اردو موسوم بہ گل رعنا'' کے آخر میں اپنے والد کے تذکرہ کے ضمن میں پیش کیے ہیں۔

فغان فخر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ہوگئی باہم جو دونوں کی نظر — آئی آفت ایک بیچارے کے سر
ہاتھ سے جاتا رہا دامان ضبط — دل کی وحشت نے بگاڑی شان ضبط
راہ راہ اپنی گئی وہ تو گذر — یہ دل صد پارہ اپنا تھام کر
بستر غم پر گرا زار و نزار — دم بدم بڑھنے لگا رنج و فشار
دل میں برپا اک قیامت کا الم — پر بہ پاس وضع آنکھیں تھیں نہ نم
تھم نہ سکتا اس سے جب گریہ کا جوش — اٹھنا یہ بیساختہ دل کا خروش

اردو قصیدوں میں سے ایک قصیدے کی تشبیب مولانا حکیم عبدالحی نے گل رعنا میں پیش کی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

زلف ہے یا شب دیجور کہ جس کے آگے — شام غربت سے زیادہ ہے رخ صبح وطن
اس کی ہر ایک گرہ سے ہے پڑی دل میں گرہ — کھل گئی یاں گرہ زلف چلیپائے سخن

مہ یک ہفتہ کہوں اس کو اسے ابر سیاہ　　یا اسے بال کہوں اس کو جبین روشن
شکل ابرو سے یہ ہوتا ہے نظر کو دھوکا　　دو ہلال ایک جگہ حق نے کئے جلوہ فگن
شرمگیں ناز بھرے دید کے قابل دیدے　　نشہ حسن میں سرشار خرد کے رہزن

مولانا حکیم فخر الدین خیالی نے اپنے پیچھے فارسی، بھاشا کے علاوہ اردو اشعار کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ان کی جن مثنویوں کی طرف اشارہ کیا گیا،ان کے علاوہ اور بھی کئی مثنویاں ہیں۔ایک ''مثنوی ماہ وخورشید'' کے نام، سے بھوپال میں لکھی گئی جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ان کا نا تمام مسودہ مولانا عبدالحی حسنی کے پاس محفوظ تھا۔ایک مثنوی نگارخانہ چین لکھی،اسے غلام احمد فروغی نے بھوپال میں چھپوایا تھا۔ایک مثنوی نظم حالؔی کے نام سے لکھی۔ یہ انہوں نے اپنے ہم زلف و نامور شیخ و مربی وجلیل القدر عالم دین مولانا سید عبدالسلام ہسوی سے متعلق ان کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہوکر لکھی تھی، پہلے خود مولانا عبدالحی نے کوشش کی تھی۔ان کا تخلص عالؔی تھا۔حالانکہ اس وقت ان کا سن صرف ۱۴ برس کا تھا۔ یہ مثنوی مولانا خیالی نے انہی کی طرف سے لکھی، چونکہ مولانا خیالی تین زبانوں میں شاعری کرتے تھے انہوں نے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تین تخلص رکھے،فخرؔ، خیالؔی اور میرؔ، عربی میں شاعری کی، مگر تیس چالیس اشعار سے زیادہ نہیں کہے، ان کے آخر کے شعری مجموعے نعت و مناجات کے ہیں۔منجیات خیالؔی نعتوں کا اور واردات خیالی ومناجات خیالی مناجاتوں کے مجموعے ہیں۔نثر کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔اکثر فارسی میں ہے جس میں ''مہر جہاں تاب'' معرکہ آرا تصنیف ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ستر ۷۰ سال کی عمر میں ۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ کو رائے بریلی میں انتقال کیا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر تابش مہدی
(دہلی)

خواجہ حسن نظامی کی نثر

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کا نام اردو زبان وادب کی تاریخ کا ایک ممتاز نمایاں نام ہے۔ وہ اردو نثر کی اس روایت کے نمایندہ ہیں جسے اردو نثر کی بنیادی روایات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو نثر کو لسانی، تہذیبی، معاشرتی اور فکری ہر سطح پر تقویت دی ہے۔ اردو زبان کا سب سے بڑا وصف اس کی سادگی اور شایستگی کو تصور کیا جاتا ہے۔ تصنع، تکلف اور خواہ مخواہ کی عبارت آرائی سے اس کا مزاج قطعی میل نہیں کھاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ صاحب نے اس وصف کو اپنی نثر میں پوری آب وتاب کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ نہ صرف ہر عام وخاص کی سمجھ میں آتی ہے، بلکہ اس میں ایک قسم کا لطف محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے اگر چہ زیادہ تر سنجیدہ، اخلاقی اور تربیتی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور بالعموم اس قسم کے موضوعات کو خشک، سپاٹ اور بے مزہ خیال کیا جاتا ہے، لیکن یہ ان کا کمال ہے کہ انھوں نے ہر موضوع کو لطیف اور مزے دار بنا دیا ہے۔ اپنے نثری رویے کے

بارے میں خواجہ صاحب نے خود ایک جگہ لکھا ہے:

''میرا خیال ہے کہ شروع زمانے میں صاف اور بے عیب عبارتیں بہت لکھ دیں۔اب زمانہ عبارت آرائی کا نہیں ہے، بلکہ مفید اور ضروری مضامین اردو زبان میں جمع کرنے کا وقت ہے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتا چلا جاؤں اور قواعد اور چستی عبارت کی پروانہ کروں۔''

خواجہ صاحب کے اس نثری رویے سے متاثر ہو کر مولانا عبدالماجد دریابادی نے کسی موقعے پر کہا تھا:

''کوئی سلیس، عام فہم، بے تکلف، دہلی کا روزمرّہ اور بول چال سننا چاہے تو حسن نظامی کی زبان سنے، کوئی میٹھی، سریلی، سجیلی، البیلی اردو کی بہار دیکھنا چاہے تو دلّی والے خواجہ کے قلم سے ترشے ہوئے نقش ونگار دیکھ کر ان پر سر دھنے۔بانکپن، شگفتگی اور ندرت بیان ان کا خاص ہنر اور اثر وگداز ان کے قلم کا بنیادی جوہر ہے۔''

خواجہ حسن نظامی نے جس وقت دنیائے قلم میں قدم رکھا اور زبان وادب کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا، اردو کافی حد تک سلیس، نکھری ہوئی اور بامحاورہ شکل میں سامنے آچکی تھی۔چوں کہ وہ جدت پسند واقع ہوئے تھے اور مزاج مجتہدانہ تھا، اس لیے انھوں نے روش عام پر چلنا پسند نہ کیا۔بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش کی اور زبان اور اس کی فرہنگ کو وسعت دے کر اس میں بعض دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کیے۔لیکن چوں کہ وہ بنیادی طور پر دہلوی تھے اور حضرت اکبرالہ بادی کا یہ دلچسپ ریمارک بھی ان کے بارے میں ملتا ہے:

حضرت ابو ہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی

اس لیے زبان و ادب کی دہلوی روایت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ دلی اور اس کی لسانی تہذیب و روایت کے وہ ہمیشہ دامن گرفتہ رہے۔ ان کا یہ رویہ ہمیں زبان و بیان کی سطح پر بھی ملتا ہے اور زندگی کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ میں بھی۔ ایسی مستقل مزاجی ہمیں بہت کم لکھنے والوں کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی نثر کا اہم اور قابل ذکر پہلو وہ ارضیت ہے، جو قاری کو ہمیشہ اپنی مٹی سے قریب رکھتی ہے۔ وہ خواہ ادب پر لکھیں، خواہ سیاست پر، خواہ مذہب و تصوف پر خامہ فرسا ہوں، خواہ سماج یا معاشرے کی اصلاح زیر گفتگو ہو، کسی بھی حال میں زمین سے ان کا رشتہ نہیں منقطع ہونے پاتا۔ ہمیشہ اپنی مٹی، اپنے ماحول اور سماج سے ان کا رشتہ استوار رہتا ہے۔ ان کا قلم جہاں اور جس سمت کو بھی چلتا ہے، اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالتا ہوا چلتا ہے، راستے میں ملنے والی ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہے، اس کا تعارف حاصل کرتا ہے اور تعارف کراتا ہے۔ یہ ان کی نثر کا ایک ایسا امتیازی پہلو ہے، جو انھیں ان کے عہد کے تمام نثر نگاروں سے نمایاں کرتا ہے۔ ایک تحریر کا حصہ ملاحظہ کیجیے:

> ''حاضرین! میں نے سویّوں کی اس پیالی کو جو گہری اور چھوٹی ہے، دیکھا تو بچپن کی لوری یاد آ گئی، جو میری اماں مجھے گود میں لے کر سنایا کرتی تھیں۔ چندا ماما دور کے، بڑے پکائیں بور کے، آپ کھائیں تھالی میں، ہم کو دیں پیالی میں، پیالی گئی پھوٹ، چندا ماما گئے روٹھ۔ پیالی آئی اور چندا ماما آئے دوڑ۔ آج کانگریس کا

اثر مجھ پر ہو رہا ہے اور اس میں، میں اس لوری کو یاد کر کے سویّوں کی اس پیالی کو دیکھتا ہوں تو یہ خوش طبعی سوجھتی ہے کہ ہندستان کی زمین ہماری پیاری ماں ہے اور انگریز اس زمین کے بھائی ہیں، جو بہت دور سے آئے ہیں۔اس لیے ہمارے ماموں ہیں اور گورے رنگ کے ہیں لہذا چاند بھی ہیں۔بس چنداماما دور کے کا مصرع ان پر صادق آتا ہے، بڑے پکائیں بور کے ان کا طرز حکومت ہے کہ بور کے لڈو کھاؤ تو پچھتاؤ، نہ کھاؤ تو پچھتاؤ۔وہ میزوں پر پلیٹوں میں کھانا کھاتے ہیں، مگر ہم کو بہت بڑی پیالی میں دیتے ہیں۔اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کھائیں تھالی میں، ہمیں کھلائیں پیالی میں۔جب ہم نے ایجی ٹیشن کیا تو پیالی گئی ٹوٹ اور چندا ماما گئے روٹھ، تب اصلاحات کی پیالی آئی اور چندا ماما بھی دوڑے آئے۔دیکھیے ہندستانی قوم اس نئی پیالی کی نسبت کیا رائے قائم کرتی ہے،،

یہ ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ کی تحریر ہے۔اپنے مشتملات کے اعتبار سے یہ خالص سیاسی تحریر ہے، لیکن اس میں اپنے مزاج اور معاشرے کی تہذیبی قدروں سے جوڑ کر قاری سے بلا واسطہ ہم کلامی کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ بہ ہر حال خواجہ صاحب کا ہی حصہ ہے۔خواجہ صاحب کی نثر سادہ ہوتی ہے مگر اس میں جو ایک خاص قسم کی پرکاری ملتی ہے، وہ نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔وہ اپنے حسن تخیل سے معمولی اور ناقابل توجہ چیزوں میں بھی حسن وخوبی اور پند ونصیحت کے پہلو نکال لیتے ہیں۔صبح کا ذکر ہو یا شام کا، پھول کا ذکر ہو یا کانٹے کا، بہار کا تذکرہ ہو یا خزاں کا، ہر چیز کی وہ کچھ ایسی تصویر کشی

کرتے ہیں کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔،،سی پارۂ دل'' کے مقدّمے میں مولوی عبدالحق نے سچ کہا ہے:

''ان مضامین میں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں، کہیں راز و نیاز ہے، کہیں درد دل کی داستان ہے اور اپنا اور ہمارا دکھڑا رو رہے ہیں، کہیں تخیّل کا زور عرش تک لے گیا، کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی کہ نظم مقفّی ہیچ ہے۔''

ہمارے نئے لکھنے والے موضوعات کے سلسلے میں اکثر شاکی رہتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر کی خوبی یا خرابی کا سہرا بڑی آسانی کے ساتھ موضوع کے سر باندھ دیتے ہیں۔ وہ اس راز کو نہیں پا سکے ہیں کہ موضوع ثانوی درجے کی چیز ہے، اصل چیز لکھنے والے کی استعداد و صلاحیت ہے۔ اگر لکھنے والا چشم بینا رکھتا ہو، اس کے تجربے اور مشاہدے میں وسعت ہو، وہ لکھنے سے پہلے سوچنے اور غور کرنے کا عادی ہو اور زبان و بیان پر بھی اس کی گرفت ہو تو وہ معمولی سے معمولی موضوع میں جان پیدا کر دے گا۔ کائنات میں بکھری ہوئی، ہر چیز اس کے قلم کی گرفت میں آکر حیات دوام حاصل کر سکتی ہے۔ ان لکھنے والوں کو اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی سے رہ نمائی حاصل کرنی چاہیے۔ خواجہ صاحب نے اپنے کمال فن سے معمولی اور ناقابل التفات اشیا کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا اور ان میں حکمت و عبرت کے ایسے اچھوتے پہلو تلاش کیے، جن تک عام ذہنوں کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ انھوں نے مکھی، مچھر، الّو، ماچس، تنکا، اینٹ حتّی کہ سور اور کتّوں جیسے سیکڑوں موضوعات پر لکھا ہے۔ بہ ظاہر یہ موضوعات اپنے اندر کوئی کشش اور دلچسپی نہیں رکھتے، لیکن جن لوگوں نے ان کی تحریروں کو پڑھا ہے، انھیں اچھی طرح یہ بات

معلوم ہے کہ خواجہ صاحب نے ان موضوعات میں فکر وخیال اور حکمت وعبرت کے کیسے کیسے پہلو نکالے ہیں.

خواجہ حسن نظامی کی نثر اردو ادب کی اس روایت کا اہم حصہ ہے، جس کی ابتدا میر امّنؔ سے ہوتی ہے اور پھر محمد حسینؔ آزاد، رتن ناتھ سرشارؔ اور عبدالحلیم شررؔ سے ہوتی ہوئی خواجہ صاحب تک پہنچتی ہے۔ لیکن اپنے مرکزی موضوع قوم کی اخلاقی وروحانی شیرازہ بندی اور اس کی عظمت رفتہ کی بازآفرینی سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ خواجہ صاحب سلوک ومعرفت کی جن راہوں پر جادہ پیما تھے اور جس دینی وروحانی وراثت کے وہ امین تھے، اپنی تمام تر سماجی اور معاشرتی ذمّے داریوں کے ساتھ وہ ان کا بھرپور احساس رکھتے تھے۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

مولانا ضیاء الدین اصلاحی
(دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

مولانا شبلی کا ادبی پایہ

مولانا شبلی ایک جامع کمالات شخص تھے۔ وہ اپنے معاصرین میں بہ استثنا سرسید احمد خاں سب سے قد آور اور بلند شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے حدود تصنیف اور قلمی فتوحات کا دائرہ بڑا متنوع تھا۔ ان کا خاص موضوع تاریخ وسوانح نگاری کو خیال کیا جاتا ہے، لیکن انہوں نے ماضی کے شان دار واقعات اور قومی مفاخر کی داستان سرائی ہی نہیں کی ہے بلکہ فلسفہ وکلام کی پیچیدہ گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ تنقید وتحقیق کی سنگلاخ وادیاں بھی قطع کی ہیں اور شعر وادب وبلاغت وفصاحت کے نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک فطری ادیب وانشا پرداز تھے، اس لیے ان کے بہار آفریں قلم نے شعر العجم اور موازنہ انیس ودبیر جیسی کتابوں ہی میں ادب وانشا کے گل بوٹے نہیں کھلائے ہیں، بلکہ ان کے خامۂ جادونگار اور قلم معجز طراز نے سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، الغزالی اور سوانح مولانا روم میں بھی ادبی لالہ کاری کی ہے اور ان کی تمام تحریروں اور ساری تصانیف کو زعفران زار اور ادب وانشاء کا چمنستان بنا دیا ہے۔ ذیل میں ان کی ادبی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے ان کے عام ادبی کارناموں کا اجمالی جائزہ لیا جائے

گا اور ان کی مکتوب نگاری اور اسلوب تحریر کی خصوصیات کسی قدر تفصیل سے دکھائی جائیں گی۔

ادبی تصانیف:

مولانا کے قلم سے خالص ادبی موضوع پر سب سے پہلی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' شائع ہوئی تھی۔ میر انیس کی عام شہرت صرف ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے تھی، مولانا شبلی نے بتایا کہ ان کا کلام تمام اصناف سخن کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کو سمجھانے کے لئے مختلف عناوین قائم کر کے میر انیس کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان کا کلام کن امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس سے میر صاحب کی شاعرانہ عظمت و کمال کے علاوہ خود مولانا کی نکتہ سنج طبیعت، بلند ادبی ذوق اور ناقدانہ نگاہ کی وسعت و گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ یہ میر انیس کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی، ورنہ ان کے سارے کمالات پردۂ گمنامی میں پڑے رہتے۔

اس میں مولانا نے امیر انیس کی شاعری کے محاسن کو نمایاں کرنے کے لیے ان کا موازنہ مرزا دبیر سے کیا ہے اور دکھایا ہے کہ مرزا دبیر ان سے کم درجے کے مرثیہ نگار اور شاعر تھے۔ اس پر مرزا صاحب کے حامی بہت برہم ہوئے، مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کی عظمت کا جو نقش دلوں پر بیٹھا دیا تھا، وہ اب تک قائم ہے۔

مولانا کی سب سے اہم، بلند پایہ اور مایہ ناز ادبی تصنیف شعر العجم ہے، جو اصلا فارسی شاعری کی تاریخ ہے، مگر اس کے باوجود وہ ایک لازوال ادبی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے اردو میں تنقید کی کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہیں تھی، مولانا نے شعر العجم لکھ کر اس کمی کی تلافی کر دی ہے۔ ان کے قلم کی بہار آفرینی اور ذہن کی نکتہ رسی سے شعر العجم ادب و انشا کا ایک چمن زار معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا، سرسبزی و شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعے سے انشا پردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے، عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، صحرا، جنگل، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں لیکن یہی عرب جب بغداد پہونچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، پورا ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار، آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختہ زمرد بن گئی، باد سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شوروہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا۔ اس حالت کا یہ اثر ہوا کہ ایران کی تمام انشا پردازی پر رنگینی چھا گئی''۔

شعرالعجم کی ایک خاص خوبی اشعار کا حسن انتخاب ہے جو مولانا نے اپنے ادبی و تنقیدی دعوؤں کے ثبوت میں شعراء کے کلام سے پیش کیے ہیں۔ ان سے پڑھنے والے میں فارسی شاعری سے دلچسپی اور شعرفہمی کا صحیح اور عمدہ ذوق پیدا ہوتا ہے۔

شعرالعجم میں خوردہ گیری کرنے والے نقادوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ ''اس موضوع پر فارسی اور اردو میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی''۔ مہدی افادی نے ناقدین کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ شعرالعجم واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ حسن و عشق کا صحیفہ اور فارسی کا تنقیدی تبصرہ ہے۔ انکے خیال میں شعرالعجم تنقید عالیہ کا بہترنمونہ ہے۔ صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایے کی تصنیف موجود نہیں اور یہ دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔

فارسی زبان وادب کے نامور عالم ومحقق پروفیسر نذیر احمد کا خیال ہے:

''اس (شعرالعجم) کے پہلے دو تین حصوں کی تصنیف تقریباً ۷۰ سال ہوئے، اس درمیان فارسی کا وافر مواد جمع ہوا جو مولانا کی دسترس میں نہ تھا، لیکن اس کے باوجود اب تک کوئی کتاب ان موضوعات پر جس کا احاطہ شعرالعجم میں ہے، شعرالعجم جیسی وجود میں نہیں آسکی۔ مولانا شبلی کی یہ تصنیف ہنوز نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے اور باوجود وسائل کی کمی کے ایسی کتاب مرتب ہوئی جو ۷۰ برس سے تاریخ شعروادب فارسی کے خطے کی تنہا حکمراں ہے۔''

ان دونوں مستقل تصانیف کے علاوہ مولانا کے متعدد ادبی وتنقیدی مقالے بھی ہیں، جن کا ایک مجموعہ مقالات شبلی حصہ دوم کی صورت میں چھپا ہے اور خاصے کی چیز ہے۔

صحافت:

صحافت بھی ادب کے زمرے ہی کی چیز ہے۔ اس میدان میں ''الندوہ'' جیسے بلند پایہ علمی وتحقیقی رسالے کا اجرا مولانا شبلی کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس رسالے میں مولانا نے نہایت عالمانہ ومحققانہ مضامین لکھے اور اس کی بدولت اردو میں علمی وتحقیقی مضامین لکھنے کا عام رجحان پیدا ہوا۔ الندوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ترجمان تھا۔ اس کے اجرا کا خاص مقصد ہونہار طلبہ کی تربیت تھا، مگر ان کے علاوہ بھی اس سے متعدد اہل قلم کی تربیت ہوئی جو آگے چل کر علم وادب کے افق پر مہر وماہ بن کر چمکے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ اخبار الہلال والبلاغ اور دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ معارف اسی نخل ادب کے ثمر ہیں۔

دارالمصنفین:

خود دارالمصنفین کی بناو تاسیس بھی مولانا شبلی کا ایک عظیم علمی وادبی کارنامہ ہے، جس نے علم وادب اور دین کی گوناگوں مفید خدمت انجام دینے کے علاوہ اردو لٹریچر کے ذخیرے اور تنقید و تحقیق نیز اردو ادب کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

مکتوب نگاری:

مولانا شبلی کے خطوط علمی و ادبی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، جو اپنی تازگی، طرفگی، ندرت، ایجاز اور سخن گسترانہ انداز کے باعث خاص قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ علی گڑھ جانے سے پہلے وہ زیادہ تر فارسی میں خط لکھتے تھے اور اپنی فارسی شاعری کی طرح اپنے فارسی خطوط کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ بھی شائع کرنا چاہتے تھے۔ اردو خطوط کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے ماموں زاد بھائی مولوی رشید الدین انصاری مرحوم نے مولانا شبلی کے اردو خطوط جمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کو لکھا ''میرے خطوط بالکل بدمزہ ہوتے ہیں، ان کو کیا جمع کرتے ہو، مجھ کو خود مزا نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا''۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے الندوہ میں خطوط جمع کرنے کا اعلان کیا تو مولانا نے اس کو پسند نہیں کیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، اس میں اپنا خوشنما نقش پا چھوڑا ہے۔ وہ یہی امتیاز اپنے اردو خطوط میں بھی قائم کر گئے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ''ابتدا ہی سے ان کے خطوط اس قدر دلچسپ ہوتے تھے کہ ان کے قدیم وطنی احباب اور تلامذہ ان کو حرز جاں بنا کر رکھتے تھے''۔ مہدی افادی کہتے ہیں ''جس روز ڈاک میں مولانا کا خط ملتا تھا اس کا پڑھنا میرے لیے ایک عیش ہوتا تھا جسے کبھی نہیں بھولوں گا۔''

مولانا کے خطوط کی اس لیے بھی اہمیت ہے کہ ان میں ان کے حالات وواقعات زندگی اور ساری سرگرمیوں کی تفصیل ملتی ہے۔ انکی زندگی جس نشیب وفراز سے گزری یہ خطوط اس سے بھرے ہوتے ہیں۔ انکی علمی، تعلیمی، ادبی، سیاسی، قومی، نجی اور غیر نجی سرگرمیوں کی داستانیں بھی ان میں موجود ہیں۔ انکے تمام منصوبوں، ارادوں اور ان تمام کاموں کی تفصیل ملتی ہے، جن کو وہ انجام دینا چاہتے تھے۔ شاگردوں کے نام جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ان کی علمی وعملی تربیت کے علاوہ ان کی حوصلہ افزائی بھی پیش نظر تھی۔

مولانا کے خطوط کی اہمیت میں اصل دخل ان کی انشا پردازی اور ادبی بانکپن کا ہے۔ مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:

''بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور ان میں یہ خطوط بھی ہیں جو بمنزلہ سدا بہار کے ہیں، اس لیے کہ یہ تکلیف اور بناوٹ سے بری ہیں، یہ دلی جذبات اور خیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں، بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشا پردازی کے داؤں پیچ سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، پڑھنے والوں کے دلوں کو لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔''

اردو کے مشہور نقاد آل احمد سرور مولانا کے خطوط کی ادبی گل کاری کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''خطوط شبلی کے مطالعے کے بغیر آپ ایک عالم، ایک مصنف اور ایک مولوی تک پہنچ سکتے ہیں لیکن شبلی تک نہیں پہنچ سکتے، جس کی حکیمانہ نکتہ سنجیوں اور شاعرانہ شوخیوں سے اردو ادب میں شادمانی اور رفعت آئی ہے۔''

مولانا شبلی کے مکاتیب کے دو حصے دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور آل احمد سرور نے اپنے تاثرات خطوط شبلی مرتبہ محمد امین زبیری کے متعلق ظاہر کیے ہیں، اس مجموعے کے خطوط عطیہ فیضی اور زہرا بیگم کے نام ہیں، جو بمبئی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم دوست خواتین تھیں، جن کے ذوق علم وادب اور علوم وفنون سے اشتغال کی بنا پر مولانا کو ان سے خاص دل چسپی ہوگئی تھی اور وہ ان کی ذہنی ودماغی تربیت اور علمی وتعلیمی رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں نے اس سے مولانا کی رنگینی طبع، رندی اور ہوسنا کی کے افسانے گڑھ لیے۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

مولانا کا تو ہر خط چاہے وہ کسی کے نام ہو ادبی رعنائیوں سے خالی نہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ نے نقوش کے مکاتیب نمبر میں لکھا ہے ''ان کا ہر خط زعفران کا ایک پھول ہے، جس میں باغ فردوس کی خوشبو ہے۔''

☆ مولانا شبلی کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت برجستگی، بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ اپنی عالمانہ شان اور پروقار متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور مکتوب الیہ کے درجہ ومرتبہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔

☆ ان کے خطوط کی ایک خوبی مزاح وطنز کی لطیف آمیزش ہے، جس میں ابتذال و رکاکت نہیں آنے دیتے تھے، اس لیے ان کی نکتہ آفرینی اور طنزیہ فقرے بازی بڑا مزہ دیتی ہے۔

☆ ان کے مکاتیب عموماً مختصر ہوتے ہیں مگر انشا پردازی و بلاغت کا کمال اور انداز بیان کی حلاوت وشگفتگی ہر جگہ جلوہ گر ہے اور چند لفظوں سے جادو پھونک دیا ہے، ایجاز ان کی ہر تحریر کا خاصہ ہے مگر جو ایجاز ان کے خطوط میں ہے، اسے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''جان اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔''

☆ ان کے خطوط کا ایک لفظ بھی زائد، بے کار اور بلاضرورت نہیں ہوتا، جچے تلے اور ضروری لفظوں کی وجہ سے اس میں عجیب طرح کی تاثیر ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی چبھتے ہوئے فقرے سے، ایک ہی مصرعے سے، ایک استعارے یا ترکیب سے، ایک ہی طنزیہ چھیڑ سے اپنے خطوں کو لذتوں اور کیفیتوں سے معمور کر دیتے ہیں۔

☆ وہ بہت سے خطوط بغیر القاب کے لکھتے تھے گویا کاغذ ہی پر گفتگو کر رہے ہیں۔

☆ بعض خطوط مکالمے کی شکل میں لکھتے تھے جس کو وہ خود باہمی گفتگو سے تعبیر کرتے تھے۔

یہ سب غالب کے رنگ کا اثر تھا، بقول مہدی ''غالب زندہ ہوتے تو ان کو اپنی اردوے خاصہ کی داد ملتی'' کیوں کہ مولانا نے بھی غالب کی طرح مراسلے کو مکالمہ اور خطوط کو گفتگو کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔

شاعری:

مولانا کی شاعری بھی ان کے ادبی کمال کا ہی حصہ ہے۔ لیکن ان کے شاعرانہ کمالات کا خاص میدان ان کی فارسی غزلیات وقصائد ہیں۔ یہ اردو شاعری کے مقابلے میں زیادہ بلند پایہ ہے، خصوصاً غزلوں میں مولانا کی سرمستی، رنگینی، زندہ دلی، جوش و مستی، نازک خیالی اور بیان کی شوخی و رعنائی، زور بلاغت اور نفاست وسلاست خواجہ حافظ کی یاد دلاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایران کا کوئی دل فریب منظر غزلیات میں مکمل طور سے موجود ہے جو اکثر بمبئی کی ولولہ انگیز اور طرب زا آب وہوا میں کہی گئی ہیں۔

مولانا نے اردو میں تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنوی ''صبح امید'' مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر اور گلزار نسیم

کی ہم ادا اور ترانہ شوق کی ہم نوا ہے۔"

سیاسی موضوعات پر جو نظمیں کہی ہیں ان میں اکثر طنز کے تیر و نشتر کی وجہ سے بڑی موثر اور دل آویز ہیں، تاریخی، مذہبی اور اخلاقی نظمیں بھی اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ انہیں اسلامی تاریخ کے پر اثر اور قابل فخر کارناموں کو منظوم کرنے کا خاص سلیقہ تھا۔ ان نظموں میں بھی بڑی تاثیر و جاذبیت ہے۔ مولانا نے اپنے دور کے بعض اہم لوگوں کے مرثیے بھی لکھے ہیں مگر یہ سب فارسی میں ہیں، اپنی زندگی کے سب سے آخری سانحے یعنی چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کی وفات پر جو دل دوز نوحہ کہا ہے وہ اردو کے بہترین مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا کی شاعری پر مستقل مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے۔

حسن اسلوب:

تاثیر اور دل نشینی کلام کی اصل خوبی ہے۔ اس کے لیے رعنائی خیال کی طرح حسن بیان بھی ضروری ہے۔ ادب و انشاء کے معراج کمال پر پہنچنے کے لئے طرز تحریر اور اسلوب بیان کا موثر اور دل پذیر ہونا ضروری ہے۔ مولانا شبلی کے بڑے ادیب و انشا پرداز ہونے کا سبب بھی ان کے طرز تحریر کی خوبی و دل کشی اور اسلوب بیان کی رعنائی و دل آویزی ہے، ذیل میں اس کی بعض نمایاں خوبیاں پیش کی جاتی ہیں:

۱) مولانا کے موضوعات تحریر میں بڑی وسعت اور تنوع ہے مگر اس کے باوجود انکی ہر تحریر میں چاہے وہ کسی موضوع پر ہو بڑی روانی، برجستگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے اور وہ خاص اثر اور جاذبیت رکھتی ہے۔ اس وصف میں مولانا دوسرے مصنفین اور معاصرین سے علانیہ ممتاز ہیں، ایک ہی طرح کے عنوانات پر مولانا اور انکے معاصرین کی تحریروں کا مقابلہ کرنے سے انکی یہ خوبی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

۲) مولانا محمد حسین آزاد کو مولانا بجا طور پر اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہتے تھے، انکی تحریروں کی اٹھان کس قدر شاندار ہوتی ہے۔ غضب کی آمد، زور، روانی اور برجستگی ہوتی ہے۔ لیکن مولانا شبلی کی تحریروں میں جو اتار چڑھاؤ اور متانت و جزالت پائی جاتی ہے وہ مولانا کے یہاں مفقود ہے۔ مولانا شبلی کی برجستگی کا لطف اس وقت زیادہ ملتا ہے جب وہ کسی مصرعے یا آیت کو اپنی تحریر میں شامل کر لیتے ہیں۔

۳) ان کو فارسی ترکیبوں کے استعمال کا بڑا سلیقہ تھا، اس سے ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی، روانی اور اثر انگیزی پیدا ہو جاتی تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر ''ظہور قدسی'' کے عنوان سے جو دل آویز تحریر لکھی ہے اس میں فارسی کی خوش گوار ترکیبوں اور خوشنما استعاروں کو کتنی بے ساختگی کے ساتھ استعمال کیا ہے جس سے عبارت نہایت دل کش اور دل نشیں ہوگئی ہے۔

۴) بے ساختگی مولانا کی تحریر کی بڑی خوبی ہے۔ انہیں اپنی کسی تحریر کے لیے تکلف و اہتمام نہیں کرنا پڑتا خود بہ خود آمد ہوتی ہے اور وہ ہر بات اس طرح بے ساختہ کہتے ہیں کہ ایک لفظ بھی زائد اور بے ضرورت نہیں معلوم ہوتا، بے ساختگی کے باوجود تحریر کا شکوہ و تجمل قائم رہتا ہے۔

۵) سادگی بھی مولانا کی تحریر کا خاص امتیاز ہے اور وہ تصنع و بناوٹ سے پاک ہوتی ہے، اس کے باوجود اس میں نہایت بے ساختگی اور حسن و لالہ کاری ہوتی ہے۔

۶) ایجاز و اختصار مولانا کی سب سے نمایاں خوبی ہے، جن چیزوں کو لوگوں نے کئی کئی صفحوں میں لکھا ہے، مولانا نے اسے چند سطروں میں لکھا ہے مگر اظہار مطلب میں کہیں خلل نہیں آنے دیا ہے۔ وہ جب کسی واقعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو رطب و یابس، معمولی اور سطحی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف مفید، ضروری

اور قابل یقین اجزا ہی کو ہاتھ لگاتے ہیں، اس کے باوجود کوئی قابل ذکر اور ضروری الاظہار بات چھوٹنے نہیں پاتی۔

مولانا طویل واقعات اور وسیع مفہوم کو ایسے الفاظ اور استعاروں میں ادا کرتے ہیں کہ تطویل واطناب سے کام نہ لینا پڑے۔ حضرت عمرؓ کا قبول اسلام تاریخ اسلام کا بڑا عظیم الشان واقعہ ہے، اس کو عام مؤرخین وعلمائے طبقات نے بہت پھیلا کر لکھا ہے، لیکن مولانا نے بڑے اختصار سے بہت مؤثر لکھا ہے جو جان بلاغت ہے۔

مولانا نے حضرت عمرؓ کے رعب داب کی تصویر کشی میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے، لیکن ان چند فقروں نے جو زور واثر پیدا کر دیا ہے وہ سینکڑوں صفحے سیاہ کرنے سے بھی نہیں پیدا ہو سکتا تھا، ملاحظہ ہو:

> ''سکندر اور تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا۔ عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا کچھ اور نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا''۔

۷) مولانا کی تحریر پر شعریت کی گہری چھاپ ہوتی ہے، انہوں نے شاعرانہ وسائل و انداز اور الفاظ وجذبات سے کام لے کر اسے نہایت پر اثر اور دل کش بنا دیا ہے، شاعرانہ فضا پیدا کرنے کے لیے وہ استعارے اور کنائے اور فارسی شاعری کے دل کش لفظوں اور ترکیبوں کے ساتھ جا بجا بہت برمحل اشعار بھی لائے ہیں۔ اس سے وہ عبارت کی خشکی دور کر کے اس کا رنگ ومزہ بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔

نثر کے خاکوں میں شاعرانہ رنگ بھرنے سے اس میں ایجاز واختصار کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا طنز کے موقع پر بھی شعر لاتے ہیں۔ اس طرح تحریر میں

نشتریت اور جوش واثر پیدا ہوتا ہے اور یہ سارا انداز غالباً ان کے یہاں جاحظ کے طرز تحریر کے اثر سے آیا ہے۔ غرض شاعرانہ تخیل نے ان کی تحریر میں جو لالہ وگل کھلائے ہیں، اس سے اس کی ادبی شان بہت بڑھ گئی ہے۔

۸) قدرت نے مولانا کو بڑی پر جوش اور مشتعل طبیعت عطا کی تھی۔ یہی جوش وخروش ان کی تحریروں سے بھی امنڈا پڑتا ہے۔ انہوں نے جن واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے، ان میں طیش و جوش کے اظہار کا موقع بھی زیادہ تھا، مثلاً تاریخ اسلام کے پر فخر کارنامے، مسلمانوں کے ماضی کے شاندار اور پر شوکت واقعات، یورپین مصنفین و مؤرخین کے اعتراضات کے جوابات، اورنگ زیب عالم گیر اور دوسرے مظلوم اور بے قصور لوگوں کی حمایت، اپنی تحقیق و اجتہاد کے نتیجے میں رائے عام کی مخالفت وغیرہ۔

ان میں سے کوئی موقع ایسا نہیں جس میں جوش واشتعال اور طیش وغضب نہ پیدا ہو۔

۹) مولانا کو اپنی تحریر پر مکمل وثوق واعتماد ہوتا ہے اور وہ اپنے موقف ومقصد کے اعلا اور برتر ہونے پر پورا یقین رکھتے تھے، اس لیے وہ ایسا اسلوب اور طریقہ اظہار اختیار کرتے ہیں جس سے سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، وہ اپنے مخاطب اور قاری کو مرعوب ومبہوت کرنے کے لیے اس کے ذہن پر اپنے علم، اپنی ذہانت و فضیلت کا نقش بیٹھا دیتے ہیں، اس سے لامحالہ ان کی تحریر میں زور، قوت اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۰) مولانا کے اسلوب میں تخیل کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، اس میں رنگ بھرنے کے لیے وہ استعارے، کنایے اور تشبیہ وتمثیل کا استعمال بکثرت کرتے ہیں، تخیل کی وجہ سے ان کے یہاں مبالغہ، شدت اور کبھی کبھی انتہا پسندی بھی آجاتی ہے، جو ان کی

ذکاوت، زود حسی اور شدت تاثر کا نتیجہ ہے۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی تحریر کا لطف و اثر جہاں بڑھ جاتا ہے وہاں اس میں ایک خاص قسم کا طنطنہ اور خود اعتمادی بھی آجاتی ہے۔

۱۱) مولانا دوسرے مصنفین اور اپنے معاصرین سے اس اعتبار سے بھی ممتاز ہیں کہ ان کی تحریریں بڑی پر وقار اور متین ہوتی ہیں جو رکاکت اور ابتذال سے پاک ہوتی ہیں۔

مولانا شبلی اردو کے صف اول کے ادیبوں اور انشا پردازوں میں بہت ممتاز تھے، ان کی جامعیت اور ان کے کارناموں کی وسعت و ہمہ گیری اور عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے مہدی افادی نے لکھا ہے:

''خاتم المصنفین شبلی نے ہمارے لیے کم و بیش پچاس ہزار صفحوں کا ذخیرۂ ادب چھوڑا ہے۔ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف جسے آج کل کی اصطلاح میں ''تنقید عالیہ'' کہتے ہیں اب اسے لوہے کا چنا کہیے، میرا خیال ہے کہ اسلام کے متعلقات میں اتنا بڑا سرمایہ اور وہ بھی اس قدر گراں پایہ کسی زبان میں موجود نہیں۔ شبلی میں ایک خاص طرح کا مادہ اختراعی تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجے کے مؤرخ، اعلیٰ درجے کے ناثر، اعلیٰ درجے کے شاعر، غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصناف سخن کے پورے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح معیار تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے کہ سینکڑوں برس بعد بھی ان کی تصانیف ٹکسال باہر نہیں ہوں گی۔ ایسا جامع حیثیات مصنف غالباً اب پیدا نہ ہوگا۔''

مولانا شبلی کی اس عظمت اور بلند پائیگی کا راز ان کی دل فریب انشا اور حسین

اسلوب میں پنہاں ہے، ادیب شبلی نمبر کے ایک مضمون نگار ناصر حسین نقوی لکھتے ہیں:

''حق یہ ہے کہ شبلی کو اردو ادب میں جو بلند مسند اور مقام حاصل ہے اس کی بنا علمی بھی ہے اور ادبی بھی، مگر جو چیز ان کے یہاں بقائے دوام کا باعث ہوگی، وہ ان کا اسلوب بیان ہے، وہ اپنے علمی انکشافات اور تاریخی رازوں کی پردہ کشائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے تیز و تند، چبھتے ہوئے گہرے زخم لگاتے ہوئے، دماغوں کو مفلوج کرتے ہوئے، دلوں میں جوش و ہیجان پیدا کرتے ہوئے طرز بیان کی وجہ سے اردو نثر میں بلند مقام حاصل کر چکے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو انہیں اردو کے باقی صاحب طرز انشا پردازوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اپنے اس خاص رنگ میں اردو کا کوئی انشا پرداز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆☆☆
☆☆☆

سعید الرحمٰن اعظمی
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

علامہ شبلی نعمانی کی علمی وادبی خدمات
ندوۃ العلماء کے حوالے سے

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کسی حال میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کی ہمہ جہت، روشن اور شاندار زندگی کا ہر پہلو نہایت معروف ومشہور ہے، وہ روشن خیال کے ساتھ روشن ضمیر بھی تھے۔ وہ اپنی تابناک زندگی میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ وسیع الخیال، دوراندیش اور ایک شاداب اسلامی فکر کے نمائندہ تھے۔ وہ قدیم وجدید کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے۔ وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم، مورخ اور ادیب تھے۔ وہ جس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے اس کا حق ادا کردیتے اور ایسے نت نئے گوشوں کو عالم آشکارا کرتے کہ بڑے بڑے مورخین، اہل علم ودانش اور سنجیدہ فکر کے حامل حضرات بھی ششدر رہ جاتے تھے۔

ان کی تصنیفات میں علم وتحقیق اور خالص اسلامی فکر وعقیدہ کا ایک دریا موجزن ہے۔ وہ ہندستان میں اسلامی ادب کے معمار اولین اور اس کے نمائندہ سمجھے جاتے

ہیں۔انہوں نے ادب وفلسفہ اور جدید علم کلام کے موضوع پر کتابیں لکھ کر اسلامی کتب خانے کو مالا مال کر دیا۔صرف ان کی آخری عمر کی تصنیف سیرت النبی کو لے لیجئے،اس کی ترتیب وتالیف اور سیرت نبوی کی ہمہ گیریت کو ایک نئے انداز اور تحقیقی اسلوب میں پیش کرنے کیلئے انہوں نے کیا کیا جتن کئے۔اس کا ایک ذرا سا خاکہ آپ ''حیات شبلی'' میں سید صاحب علیہ الرحمۃ کے قلم سے پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علامہ کو ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر گہرا اور والہانہ تعلق تھا:

''۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے پر حاضری کے لئے بے تاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہوگئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد وغزالی اور رازی وبوعلی سینا کا گذر ہے، نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے، شب وروز کتب واحادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے، کھری چارپائی ہو یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا اور انہی درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گذر جاتا، اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربار رسالت کا آستانہ (مکاتیب اول عبدالحکیم۔۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، یہی ایک خیال ان پر چھا رہا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط وکتابت تھی، اس زمانے سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط ومکاتیب کو پڑھ ڈالئے ان میں تین باتیں

آپ کو ملیں گی، ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت وحفاظت، اور سیرت نبوی، یہاں تک کہ دم نزع بھی آخر لفظ جو ان کی زبان سے نکلا وہ سیرت ہے۔ سیرت کی حیثیت ان کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی، بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

''اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے'' (مقدمہ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جز یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تفسیر وتشریح کا نام تھا، اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا، اور اس کو وہ سرمایۂ سعادت دارین سمجھتے تھے (مکاتیب اول حصہ، اضافہ ۲)'' (حیات شبلی، ص: ۵۰، ۵۱)

چودھویں صدی ہجری کے آغاز اور انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں جب اس ملک پر اسلامی علوم وفنون کے مراکز اور اسلامی عقیدہ کو مٹانے کے لئے انگریزی دور حکومت میں تعلیم کے دو الگ الگ نظریے کا فتنہ برپا ہوا، انگریز حکومت کے ذریعہ عیسائیت نے اپنا قدم جمایا، مشنریوں کے جال ہر طرف پھیل گئے، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا، علمائے اسلام عام طور سے اپنی تعلیمی

سرگرمیوں میں مصروف رہ کر اس فتنے سے غافل تھے اور غیر اہم فقہی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے اور بازار بحث ومجادلہ گرم تھا۔ تکفیر وتفسیق کے فتوے جاری ہو رہے تھے دین، عیسائیت کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات سے بے نیازی کے شکنجہ میں اپنی خوبصورتی اور ہمہ گیریت کے امتیاز کو کھو کر دیگر عام مذاہب کی طرح بے اثر اور زندگی سے محروم مذہب بن کر رہ گیا تھا کہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی کی موقع پر چند نفوس قدسیہ مذکورہ صورت حال پر غور کر رہے تھے۔ ان میں سب سے محترم اور باکمال استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ محمد حسین الہ آبادی، مولانا محمد اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد محدث، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا محمود الحسن شیخ الہند، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا عبدالغنی خاں صاحب منور شید آبادی، مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی اور مولانا شاہ تجمل حسین دسنوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان منتخب علماء کے جلسہ میں طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے، چنانچہ وہ مجلس ندوۃ العلماء کے نام سے قائم ہوئی جس کا بڑے پیمانہ پر ملک گیر اعلان کیا گیا اور عوام وخواص ہر حلقے میں اس کا زبردست استقبال ہوا۔ اس اعلان پر لبیک کہنے والوں میں ہندوستان کے زبردست عالم ومحقق، مدبر ومفکر علامہ شبلی نعمانی تھے۔ ان کو ندوۃ العلماء کے مقاصد میں اپنا گوہر مقصود ہاتھ آ گیا، اور مسلمانوں کے اندر اسلامی روح پیدا کرنے اور ان کی اصلاح میں دل وجان سے لگ گئے، اور اپنی دیرینہ تمنا کو ندوۃ العلماء کے مقاصد میں برآتے ہوئے دیکھ کر اس قافلے میں شریک ہو گئے۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۴/اپریل ۱۸۹۴ء میں کانپور کے

مدرسہ فیض عام میں منعقد ہوا، تو جلسہ کے تیسرے دن ۱۷ر شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۷ر اپریل ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے چند تجاویز پیش کیں، اور ان پر غور و بحث ہونا قرار پایا، اس کی مختصر تفصیل حضرت سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''تیسرا جلسہ ۱۷ر شوال مطابق ۲۴ر اپریل کو صبح ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش اور ان پر غور و بحث ہونا قرار پایا ہے:

پہلی تجویز: موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

دوسری تجویز: اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں۔

تیسری تجویز: اس امر میں سعی کی جائے کہ مدارس اسلامیہ جو کثرت سے جا بجا قائم ہیں ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثلاً مدرسہ دیوبند، مدرسہ فیض عام کانپور اور مدرسہ احمدیہ آرہ وغیرہ بطور دارالعلوم کے قرار دیے جائیں، اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں، اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کاروائی ان دارالعلوموں کی نگرانی میں رہے۔

چوتھی تجویز: مدرسہ فیض عام کانپور چونکہ باعتبار تعلیم نہایت اعلیٰ مرتبہ کا مدرسہ ہے اور بہ تعداد کثیر عربی پڑھنے والے طلبہ اس میں موجود ہیں، لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا

ہے، بلکہ ان کی آسائش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہوسکتا، لہذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو بلحاظ محبت و ہمدردی ضرور ہے کہ مدرسہ فیض عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطے جس میں دوسو پردیسی طلبہ رہ سکیں، حسب حیثیت چندہ دیں، اور مستحق ثواب ہوں"۔

(حیات شبلی ص ۳۰۷۔۳۰۹)

علامہ شبلی کی دلچسپی اور ندوۃ العلماء کے تمام پروگراموں میں حصہ لینے کا سلسلہ برابر جاری رہا، ان کے مشورے اور ان کے خیالات سے مجلس ندوۃ العلماء کو برابر فائدہ پہونچتا رہا، اور تعلیم کے میدان میں ترقی اور نصاب تعلیم میں خاصی اصلاحات ہوئیں، انہوں نے اپنی دیگر مصروفیات سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے آپ کو سراپا ندوہ کی خدمت اور اس کے پروگراموں میں مقصدیت کی روح پھونکنے کے لئے تیار کرلیا۔

ندوۃ العلماء کے ایک اہم ترین تعلیمی شعبہ کو بروئے کار لانے کے لئے اور مروجہ نصاب تعلیم میں اصلاح اور تبدیلی کا عمل شروع کرنے کیلئے دارلعلوم کا قیام ایک ناگزیر ضرورت تھی، اس کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ زمانہ کے تقاضوں اور رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جس کے ذریعہ دعوت اور اسلام کی صحیح ترجمانی اور مغربی تہذیب کے اس دور میں اسلامی تہذیب کی بالادستی قائم رکھنے کی صلاحیت علماء کے اندر زیادہ اچھے اور مؤثر انداز سے پیدا ہوسکے، علامہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا انقلابی عمل تھا، اور اس کو جاری کرنے کے لئے دارالعلوم کا قیام ازحد ضروری قرار دیا گیا، چنانچہ ندوۃ العلماء کا تیسرا اجلاس منعقدہ شہر بریلی بصدارت مولانا محمد لطف اللہ صاحب منعقد ہوا، یہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۶ء کا زمانہ ہے، اجلاس کے دوسرے دن ۲۷ر شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ر اپریل ۱۸۹۶ء کو مولانا عبدالحق حقانی نے

دارالعلوم قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور علامہ شبلی نے اس کی تائید میں اور دارالعلوم کی ضرورت کے موضوع پر تقریر فرمائی، اس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرمایا، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور دیگر علمائے ندوہ نے اس تجویز سے متعلق تقریریں کیں اور طے ہوا کہ "مجلس دارالعلوم" کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کی جائے، اس کے قواعد وضوابط تیار کرنے کیلئے علامہ شبلی کو مکلف بنایا گیا، تاکہ وہ تمام ارکان کے پاس بھیج کر منظور کرائے جاسکیں۔ اور ندوۃ العلماء کے چوتھے اجلاس میں جو میرٹھ میں شوال ۱۳۱۴ھ مارچ ۱۸۹۸ء میں منعقد ہوا اس میں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کرنے کیلئے لکھنؤ شہر کا انتخاب کیا، اور ایک وفد ترتیب دیا گیا تاکہ وہ لکھنؤ جاکر دارالعلوم قائم کرنے کیلئے کوئی مناسب زمین دیکھ کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ اس پر عمل ہوا اور دارالعلوم کے قیام کا خواب حقیقت بن کر رہا۔

علامہ شبلی بحیثیت معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء:

دارالعلوم قائم ہونے کے بعد اس کے معتمد تعلیم کی حیثیت سے علامہ شبلی کا انتخاب عمل میں آیا اور وہ ۱۵ر صفر ۱۳۲۳ھ مطابق اپریل ۱۹۰۵ء کو باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوئے۔ اس اہم عہدہ کے لئے علامہ کا نام مولانا غلام محمد فاضل ہوشیار پوری نے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا تھا، اور جملہ ارکان نے بالاتفاق اسے منظور کیا اور طے پایا کہ مولانا سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنا بیشتر وقت لکھنؤ میں گذاریں، چنانچہ باقاعدہ انتخاب کے بعد وہ ۱۹۰۵ء کے شروع ہی میں لکھنؤ اور قدیم دارالعلوم کی عمارت جو گولہ گنج میں تھی اور خاتون منزل کے نام سے مشہور تھی اس کی بالائی منزل پر ایک کمرہ میں قیام فرمایا اور جدید نصاب مرتب کرنے کیلئے قدیم عربی نصاب کے نقائص کو پیش کرکے نئے نصاب

تعلیم کو مرتب کیا۔ ندوۃ العلماء کے تخیل کے مطابق اصلاح نصاب کے سلسلہ میں ملک کے مشہور علماء سے استصواب کیا گیا تھا اور جب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں اصلاح نصاب کے موضوع پر اکابر علماء کا ایک جلسہ ہوا۔ سب نے اصلاح نصاب کی ضرورت کا اعتراف کیا، اس کے بعد ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء میں شہر مدراس میں دوسرا جلسہ منعقد ہوا، جس میں اصلاح نصاب کی ترتیب کیلئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ارکان مولانا عبدالقیوم حیدرآبادی، مولانا سید عبدالحئی حسنی اور مولانا شبلی نعمانی تھے، اس کمیٹی نے مولانا شبلی نعمانی کی ترمیمات کو پیش نظر رکھ کر نصاب تیار کیا، وہ حسب ذیل خصوصیات پر مشتمل تھا:

"۱۔ ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، مختصر المعانی کے علاوہ دلائل الاعجاز، اعجاز القرآن باقلائی اور نقد الشعر درس میں داخل کی گئی۔

۲۔ تفسیر بیضاوی کے ۱۵/ پارے درس میں داخل کئے گئے، مصر میں اس زمانہ میں ایک نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی، جس کا نام "الصراط المستقیم" ہے اس میں قرآن مجید کی صرف آیتیں جمع کر کے ان کی مختصر تفسیر لکھی ہے جو فقہ، کلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے خاص قرآن مجید کی منصوص فقہ، کلام اور اخلاق کے مسائل معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی درس میں داخل کی گئی۔

۳۔ عقائد میں پہلے ابن رشد کی "کشف الأدلة" اور اقتصاد امام غزالی داخل کی گئی تھیں، لیکن اب اس کے بجائے امام رازی کی "معالم فی أصول الدین" رکھی گئی۔

۴۔ فلسفے میں "هدية سعيدية"، "شرح حكمة العين" اور "شرح حكمة الاشراق" داخل کی گئی۔اس آخری کتاب میں اشراقیوں کا فلسفہ ہے۔جس کے متعلق درس قدیم میں کوئی کتاب داخل نہ تھی۔

۵۔ اسرار شریعت میں "حجة الله البالغة" نصاب میں رکھی گئی۔

۶۔ فلسفۂ جدیدہ میں "دروس الأولية" رکھی گئی اس میں سائنس کے جدید مسائل ہیں،اور بیروت سے اچھی ہے۔

۷۔ انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی۔

نصاب قدیم میں کسی تغیر اور اصلاح کا گوارا کرنا لوگوں کو اس وقت شاق تھا کہ گویہ نصاب ۱۹۰۴ء میں منظور ہو چکا تھا،لیکن اس پر عمل نہیں ہوا تھا، مدرسین وہی قدیم کتابیں پڑھاتے تھے، یہاں تک کہ مولانا نے حیدرآباد سے آکر ندوہ میں قیام کیا اور جبریہ حکم دیا، جب جا کر اس کی تعلیم جاری ہوئی۔اس پر بھی بعض مدرسین خارج شدہ کتابیں پڑھایا کرتے جس کو بڑی سختی سے روکا گیا ہے۔

ایسے علماء جو موجود زمانہ میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، غیر ملکوں میں بلکہ خود اپنے ملک میں بھی اسلام کی تبلیغ کے فرض ادا کر سکیں۔معترضین اسلام کے جوابات دے سکیں اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی کر سکیں۔بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں،اس خیال کی بنا پر مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی کے داخل کئے جانے پر بہت زور دیا۔"

(حیات شبلی ص ۴۱۴ تا ۴۱۶)

علامہ شبلی نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی دوراندیشی سے آنے والے زمانے کے تقاضوں کا ادراک کر کے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کو بھی نصاب تعلیم میں داخل کیا اور دارالعلوم میں باقاعدہ اس کا درجہ قائم کیا، اسی طرح مولانا نے مصر و شام کے سفر میں بول چال اور روزمرہ کی عام زندگی کیلئے عربی میں استعمال ہونے والے نئے الفاظ کی ایک فرہنگ تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اپنے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو مکلف کیا کہ وہ ''لغات جدیدہ'' کے نام سے ایک ڈکشنری تیار کریں، اور ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں اس تجویز کو منظور کرا کے اس پر کام کرنے کی ہدایت کی گئی، چنانچہ انہوں نے ''لغات جدیدہ'' کے نام سے ایک کتاب تیار کی جو ہندوستان کے عربی مدارس کے حلقوں میں مقبول ہوئی۔

علامہ شبلی نے اپنی معتمدی کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے اور تعلیم و تربیت اور دعوت و فکر کے میدان میں ہونہار اور ذہین طلباء کو تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی ان کو فراہم کرنے میں اپنی طاقت کو صرف کیا اور مختلف النوع شعبوں کا اضافہ کر کے ندوۃ العلماء کے ہمہ گیر تخیل کو فروغ دینے اور اسکو ایک حقیقت ثابت کرنے کی سعی بلیغ کی انہوں نے اپنی معتمدی کے پہلے ہی سال میں چند ممتاز طلبہ کی تربیت پر اپنی خاص توجہ صرف کی، ان میں مولانا ضیاء الحسن علوی (انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد)، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا جواد علی خان عالی قابل ذکر ہیں۔

تحریر کے ساتھ تقریر کی مشق کی طرف بھی مولانا نے خاص توجہ مرکوز کی، اور بذات خود اس شعبہ کی نگرانی کر کے مقررین کی ایک جماعت تیار کر ڈالی، ان مقررین میں چند کے نام یہ ہیں۔

مولانا عبد الباری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا

عبدالسلام ثانی (ایم،اے،ایل،ایل بی اعظم گڑھ) مولانا سید نجم الہدیٰ دسنوی، مولانا محمد حسن اعظمی، خواجہ عبدالواحد کانپوری۔

درس وتدریس میں لائق وفائق مدرسین کی ایک جماعت بھی تیار ہوئی، اس کیلئے درجۂ تکمیل بطور ایک مستقل شعبہ کے قائم کیا گیا اور یکم مئی ۱۹۰۹ء کو منعقد جلسۂ انتظامیہ میں اس درجہ کا نصاب تعلیم تیار کرنے کیلئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی، اس کمیٹی کے تجویز کردہ نصاب کو علمائے ہند کی خدمت میں بھیج کر ان کی رائے معلوم کی گئی اور اس کی روشنی میں بروقت علم کلام اور علم ادب میں تکمیل کا نصاب مقرر ہوا اور اس کو جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۳۰ر جون ۱۹۰۹ء میں پاس کر کے جاری کرایا گیا، یہ نصاب مندرجہ ذیل ہے۔ اور ''حیات شبلی'' میں دیئے ہوئے اس نصاب کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نصاب علم کلام برائے تکمیل

شرح مقاصد علامہ تفتازانی تھافت الفلاسفۃ امام غزالی وابن رشد

کتاب الصفات امام بیہقی برائے مطالعہ، رسائل اربعہ امام غزالی برائے مطالعہ

بحث عصمت انبیاء از ملل و نحل علامہ ابن حزم برائے مطالعہ، کتب آریہ مثلاً ستیارتھ پرکاش

تلخیص المقال و کشف الأدلۃ ابن رشد واظہار الحق از مولانا کیرانوی برائے مطالعہ

حدیقۃ فکریۃ برائے مطالعہ، کتاب الروح ابن القیم برائے مطالعہ

علم ادب

دیوان امرئ القیس و نابغۃ ذبیانی و علقمۃ الفحل، موازنہ ابی

تمام و بحتری

عروۃ بن الورد و الفرزدق، عقد الفرید ابن عبدربہ برائے مطالعہ

کتاب الصناعتین ابوہلال عسکری، مشق نظم و نثر

اسرار البلاغۃ عبدالقاہر جرجانی

(حیات شبلی ۴۲۸ تا ۴۲۹)

درجۂ تکمیل کی افادیت نمایاں طور پر محسوس ہوئی اور علامہ شبلی کے ذہن میں دوسرے علوم وفنون کیلئے بھی نصاب تیار کرانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں علم تفسیر کا درجۂ تکمیل کھولا گیا اور فقہ و اصول فقہ میں تکمیل کیلئے بھی نصاب بنایا گیا اور اس کا خاطر خواہ فائدہ ظاہر ہوا۔ اس لئے کہ مولانا علوم قرآن پر توجہ مرکوز کرانے کیلئے بہت سنجیدہ تھے اور جوں ہی امام باقلانی کی کتاب ''اعجاز القرآن'' مصر سے چھپ کر آئی۔ تفسیر کے درجۂ تکمیل میں اس کو داخل کرادیا، اسی کے ساتھ قرآن کریم کا درس بھی نصاب میں داخل کیا گیا اور خود بھی قرآن کریم کا درس دینا شروع کیا، اس درس میں اکثر طلباء و بعض مدرسین بھی شریک ہوتے تھے اور ہر مسئلہ پر پوری بحث ہوتی تھی۔ اس موضوع پر انہوں نے خاصی توجہ مرکوز کی تھی اور علوم قرآن میں مہارت رکھنے والے اساتذہ سے بھی قرآن کے درس کی درخواست کرتے تھے، جیسے مولانا حفیظ اللہ صاحب بندولی، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ضیاء الحسن علوی صاحب وغیرہ۔

کتب خانہ ندوۃ العلماء کی توسیع

علامہ کو مختلف موضوعات پر کتابوں کی فراہمی اور ان کے مطالعہ سے جو شغف تھا وہ اظہر من الشمس ہے اور کتب خانہ کو ہر موضوع پر وسیع کرنے اور زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے سلسلہ میں اپنی توجہات کو مرکوز کیا اور ہندوستان کے مشہور اہل علم کے کتب

خانوں کو ندوہ کے کتب خانہ میں ضم کرانے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیابی ہوئی، اور جلد ہی کتب خانۂ ندوۃ العلماء ایک بڑا اور اپنے مراجع اور بنیادی کتابوں کی حیثیت سے مشہور و معروف ہو گیا اس کام کیلئے علامہ شبلی نے کتابوں کے ساتھ ساتھ عطیات بھی قبول کئے اور باہر سے ضروری اور مفید کتابیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی تھیں منگوا کر کتب خانہ کو مزین کیا اور اس کو وسعت عطا کی، یہی وجہ ہے کہ آج یہ کتب خانہ علامہ شبلی کے نام سے موسوم ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دور میں اس کو "کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی" کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس کی وسعت میں برابر اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ آج کتب خانہ میں مطبوعات اور مخطوطات کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے اور کل کتابوں کی تعداد پونے دو لاکھ (۱۷۵۰۰۰) ہے۔

ماہنامہ الندوہ کا اجراء

ندوۃ العلماء کے تخیل کو اپنانے اور اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی راہ میں اردو زبان میں ایک علمی اور تحقیقی ماہنامہ شائع کرنے کا شدید تقاضا علامہ شبلی نعمانیؒ کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں ان کی تحریک سے الندوہ کے نام سے ایک رسالے کا اجرا عمل میں آیا اور اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ میں اس کا پہلا شمارہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی ادارت میں منظر عام پر آیا۔ علامہ شبلی کو اس وقت شریک ادارت نہیں کیا گیا اس کمی کو دوسرے ارکان نے محسوس کیا اور بالآخر ۱۹۰۴ء کے آخر میں الندوہ کا مقام اشاعت شاہجہاں پور طے ہوا جہاں مولانا سید عبدالحی حسنیؒ مددگار ناظم کی حیثیت سے ناظم ندوۃ العلماء کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ ناظم اور مددگار ناظم کے مشورہ سے رسالے کے دو ایڈیٹر مقرر ہوئے، ایک مولانا

حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، جوان دنوں علی گڑھ میں تھے دوسرے علامہ شبلی نعمانی جن کا قیام حیدرآباد میں تھا۔

اس رسالے کی افادیت اور اس کے علمی دوررس اثرات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل ونقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم وجدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت محققانہ مضمون شائع ہوئے، جو زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم ہی کے قلم سے نکلے تھے، اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی تھی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن پر گو بہت لکھا جا چکا تھا پھر بھی جو آتا تھا وہ انہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، منطق وفلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیئے لکھنا، تعلیقات لکھنا، غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا یہ علماء کے مشاغل تھے، حالانکہ زمانہ کا رخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے۔ الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں لیکن انہوں نے اس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے۔

اس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے،

زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے جو اس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اسی کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علماء اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بیحد پڑا اور نام نہیں لوں گا مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی اور ان سے دین وملت کو فائدہ پہونچا۔

خود دارالعلوم کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہونچا اور کئی مستعد طالب علموں کی جو اس وقت کے مشہور مصنف ہیں بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی اور اس طرح اہل علم کی بھری محفل میں ان کو زبان کشائی کی جرأت ہوئی چند ہی نمبروں کے بعد اہل نظر کی نگاہیں الندوہ کی اس افادی حیثیت پر پڑیں، الندوہ میں علم حدیث پر دارالعلوم کے ایک طالب علم (سید سلیمان بہاری) کا جو مضمون چھپا تھا اس کو پڑھ کر مولانا حالی نے مولانا کو لکھا سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا، فبارك الله فيها و في طلبتها و في تعليمها، مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کریگی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کرسکی۔"

(حیات شبلی ۴۴۰ تا ۴۴۲)

الندوہ کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد مولانا ابوالکلام آزاد اس کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور چند مہینے اس کی ادارت میں حصہ لینے اور اس میں مضامین لکھنے کا اثر یہ ہوا کہ وہ تمام علمی اور صحافتی حلقوں میں روشناس ہو گئے اور علامہ شبلی کی تربیت میں رہ کر وہ بام عروج تک پہونچے اور الہلال کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا طائر شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام آزاد بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانے تک ان کو اپنے پاس ندوے میں رکھا۔ وہ ان کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنی فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے۔ یہیں انہوں نے مولانا حمید الدین فراہی صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کئے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔"

(حیات شبلی ۴۴۳ تا ۴۴۴)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب "حیات عبدالحی" میں علامہ شبلی کے ندوۃ العلماء کی معتمدی کے دور کی علمی اور ادبی ترقیوں کا ذکر نہایت تفصیل کیساتھ کیا ہے اور عقیدت و اعتراف کے اسلوب میں ان کے کارناموں کو شمار کرایا ہے،

مولانا کے قلم گہربار سے ''حیات عبدالحی'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''عرصے سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسا شخص جو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہو اور تعلیم و تدریس کا عملی تجربہ رکھتا ہو، اسی کے ساتھ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان کو مناسب طریقہ پر نشو ونما دینے اور ان میں صحیح علمی ذوق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، دارالعلوم میں مستقل قیام کرے، اساتذہ وطلباء سے براہ راست ربط ہو اور وہ ان کے مجلس انتظامی کے درمیان رابطہ کا کام دے۔ علامہ شبلی معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے تھے، اپنے عہدہ کے لحاظ سے بھی اور اپنی صلاحیتوں اور علمی امتیاز کی بنا پر بھی وہ اس کام کیلئے سب زیادہ موزوں تھے، اس لئے انہیں سے یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کریں، وہ جب سے علی گڑھ سے یکسو اور حیدرآباد کے تعلق سے بددل ہوئے تھے اور ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو انہوں نے اپنی تمناؤں کی تکمیل کا سب سے موزوں میدان سمجھا تھا خود ان کی بھی خواہش تھی کہ وہ یہیں آکر بیٹھ جائیں اور اپنی ساری صلاحیتیں اسی مقصد کی تکمیل کیلئے صرف کردیں، جو ان کے فکر ونظر کے بھی مطابق تھا اور ان کی تعلیم وتربیت اور ذوق ورجحان کے بھی، ان کو اپنے کو کلی طور پر یکسو کرنے کیلئے کچھ وقت لگا لیکن بالآخر صفر ۱۳۲۳ھ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہ باقاعدہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے دارالعلوم کی عمارت (خاتون منزل گولہ گنج) میں منتقل ہوگئے اور باقاعدہ قیام شروع فرمادیا۔

علامہ شبلی کے دارالعلوم میں مستقل طور پر آجانے سے طلباء میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، ان کی طاقتور اور دلآویز شخصیت طلباء کے سامنے خضر راہ بن کر آئی۔ان میں مطالعہ، مضمون نگاری اور تقریر کا ذوق پیدا ہونے لگا۔مطالعہ میں تنوع اور معلومات میں وسعت پیدا ہوئی ان کی مجلسیں جو علمی مسائل، کتابوں اور مصنفین کے تذکرے، کلامی و تاریخی مباحث اور شعر وسخن اور ادبی چاشنی سے کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں۔ ہونہار طلباء کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں، اس کا نتیجہ تھا کہ ذہن اور حوصلہ مند طلباء جو یوپی اور بہار کے پرانے علمی خاندانوں اور آسودہ حال گھرانوں سے ندوہ کو قدیم وجدید علوم کی ایک جامع درسگاہ سمجھ کر آئے یا بھیجے گئے تھے، ان کے گرویدہ اور عقیدت مند ہونے لگے اور مولانا کی بھی ان نوجوانوں پر جن کو وہ جوہر قابل سمجھتے تھے، تربیت و عنایت کی خاص نظر رہتی اور وہ ان کی اندرونی صلاحیتوں کو ابھارنے اور پروان چڑھانے میں مصروف رہتے، کسی سے مضمون لکھواتے، کسی کو تقریر کیلئے تیار کرتے، کسی کو مطالعہ کا مشورہ دیتے، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی مولوی ضیاءالحسن علوی ندوی (ایم۔اے علیگ وانسپکٹر مدارس عربیہ) مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد (جو ندوہ کے طالب علم کبھی رہے، لیکن الندوہ کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے دارالعلوم کی اسی عمارت میں مقیم اور مولانا کی علمی اور ادبی مجلسوں کے مستقل شریک وحاضر باش تھے)، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، حاجی معین الدین ندوی وغیرہ اسی دور کی

یادگار ہیں، جو اپنی اپنی فطری صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق نمایاں و نامور ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے دائرہ، اس کے جلسوں کی رونق اور اس کے دارالعلوم کی توسیع وترقی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ رسالہ "الندوہ" کے وقار واعتبار سے (جو اس دور کا سب سے بلند پایہ علمی ودینی رسالہ سمجھا جانے لگا تھا) اور دارالعلوم کی شہرت میں بھی ترقی ہوئی۔ اشاعت اسلام کی تحریک (جو شروع سے ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں شامل تھی) میں بھی کچھ جان پیدا ہوئی، کچھ ایسی تجویزیں بھی ندوۃ العلماء کے جلسوں اور اس کے اسٹیج پر آئیں جن سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ ندوہ کی تحریک صرف ایک درسگاہ کے حدود میں نہیں، بلکہ اس کا مسلمانوں کی پوری ملی زندگی سے تعلق ہے، مثلاً وقف علی الاولاد کے قانون کی ترتیب اور اس کے منظور کرانے کی کوشش، قرآن مجید کے تراجم پر اصلاحی وعلمی نظر، انگریزی کے ایک مستند ترجمۂ قرآن کی تکمیل، سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا ندوۃ العلماء کی نگرانی میں انتظام، نماز جمعہ کیلئے مسلمان ملازموں کو چھٹی دیئے جانے کی تجویز وغیرہ وغیرہ جس کے تخیل میں بلاشبہ علامہ شبلی کا وسیع اور بلند حوصلہ ذہن پیش پیش تھا۔"

(حیات عبدالحی ۱۶۰۔۱۶۲)

ندوۃ العلماء سے علامہ شبلی کے بے لوث اور وسیع تعلق کا ایک سرسری خاکہ اس چھوٹے سے مضمون کے ذریعے پیش کیا گیا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ؎

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے

علامہ نے ندوۃ العلماء کی توسیع وترقی اور اس کے دارالعلوم کو ہمہ جہت علمی اور دعوتی مرکز بنانے کی راہ میں اپنا بیش قیمت وقت صرف کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اسلام کی شرح و ترجمانی کرنے کیلئے علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو جامعیت اور اسلامی فکر کی صحیح نمائندگی کر کے اسلام کو انسانی زندگی کا دائمی دستور العمل ثابت کرے کہ وہ عالم انسانیت کیلئے زندگی کا پیغام ہے اور اس کے تمام مسائل موجودہ یا آنے والے کا حل بھرپور طریقہ سے اس میں موجود ہے اور اسی کی اتباع میں صراط مستقیم کا راز مضمر ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ" اس کی مکمل تفسیر ہے۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

اردو زبان وادب کے ارتقاء میں
علامہ شبلی کا حصہ

علامہ شبلی کے ایک بڑے ناقد شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ "قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ کسی معجزے سے کم نہیں"۔[1] زیر نظر مقالے میں اسی معجزے کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

علامہ شبلی جامع کمال شخص تھے۔ان کے کارناموں کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے، جس کے ذکر کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ یہاں محض ان کے ان عظیم الشان کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مقالہ نگاری: اردو میں مقالہ نگاری کی ابتداء سرسید مرحوم کا کارنامہ ہے۔ علامہ شبلی نے اسے مزید ترقی دی اور اسے ایک نیا اسلوب وانداز عطا کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خالص تاریخی مقالہ نگاری کی ابتداء کا سہرا علامہ شبلی ہی کے سر ہے۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، تراجم، حقوق الذمیین وغیرہ ان کے ایسے

۱۔ موج کوثر، ص۔۲۳۴ تاج کمپنی دہلی ۱۹۹۹ء

معرکہ آرا تاریخی مقالات ہیں جن کا آوازہ شہرہ ہندستان سے نکل کر عالم اسلام بلکہ یورپ تک پہنچا۔

علامہ شبلی نے مختلف النوع موضوعات پر بے شمار علمی و تحقیقی مقالات سپرد قلم کیے جنہیں مولانا سید سلمان ندوی نے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی، فلسفیانہ وغیرہ موضوعات کے لحاظ سے آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ مقالات اپنے موضوعات پر کسی بلند پایہ تصنیف سے کم نہیں۔ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے علامہ شبلی کے یہ مقالات بلاشبہ ذخیرہ اردو میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوانح نگاری: اردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی کی حیات سعدی سے ہوا۔[1] علامہ شبلی اس عہد کے دوسرے سوانح نگار ہیں جنہوں نے سلسلۂ نامورانِ اسلام کے تحت متعدد سوانح عمریاں مثلاً المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم لکھیں اور سوانح نگاری کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا، الطاف فاطمہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے:

> ''مولانا شبلی نعمانی کی روشن اور پرجلال شخصیت اس دور کی سوانح نگاری پر کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ان کے معاصرین کی نوشتہ سوانح عمریوں کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ گئی ہے۔[2]

علامہ شبلی کی سوانح عمریاں دو قسم کی ہیں، تاریخی اور غیر تاریخی۔ اردو میں تاریخی سوانح نگاری علامہ شبلی کا کارنامہ ہے، المامون اور الفاروق ان کی ایسی ہی عظیم الشان کاوشیں ہیں جو ذخیرہ ادب میں ان کا گراں قدر عطیہ ہیں، اردو کے سوانحی ادب کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہماری ادبی تاریخ اس کی دوسری مثال اب تک نہ پیش کر سکی۔

۱۔ مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص ۷۵۔ دہلی ۱۹۹۹ء ۲۔ فن سوانح نگاری کا ارتقا ص ۱۱۳

فن سوانح نگاری کے لحاظ سے بھی علامہ نے مولانا حالی کے قدم کو آگے بڑھایا اور اصول سوانح نگاری کی وضاحت کی۔

تاریخ نگاری: مہدی افادی نے علامہ شبلی کو تاریخ کا معلم اول قرار دیا ہے۔[۱] خود علامہ شبلی نے اپنی تصنیفات کا میدان تاریخ کو قرار دیا تھا۔[۲] چنانچہ وہ مدت العمر تاریخ کی خدمت کرتے رہے اور اردو کو چند لازوال تاریخی کتابوں سے بہرہ ور کیا۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النبی اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر اور متعدد تاریخی مقالات ان کے قلم سے نکلے جو ان کے گہرے تاریخی شعور اور مورخانہ بصیرت کے نمونے ہیں، جو نہ صرف ان کے لیے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے قابل فخر ہیں۔

علامہ شبلی اردو کے پہلے ایسے مورخ ہیں جنہوں نے ابن خلدون کے بعد اصول تاریخ نگاری کی طرف توجہ دی اور اس کے اصول وضوابط وضع کیے، ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

> ''وہ صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع ونقاد بھی تھے۔ انہوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمائے پر جو تنقید کی ہے وہ بلاشائبہ مبالغہ اصول تاریخ کے لئے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے۔''[۳]

علامہ شبلی نے نہ صرف اصول وضع کئے بلکہ عملی طور پر اپنی تاریخی تصنیفات میں ان کو برتنے کی بھی کوشش کی، بے شبہ اردو کے تاریخی ادب میں علامہ شبلی کی یہ کوشش سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنقید نگاری: اردو شعراء کے قدیم تذکروں میں تنقید کے ابتدائی عناصر ملتے

۱۔ افادات مہدی ص ۱۹۲ ۲۔ علم الکلام ص ۴ ۳۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۷۲ علیگڑھ ۱۹۹۴ء

ہیں لیکن اردو میں فن تنقید نگاری کا باقاعدہ آغاز مقدمہ شعروشاعری سے ہوا۔[1] علامہ شبلی، مولانا حالی کے ساتھ اولین تنقید نگار ہیں جنہوں نے فن تنقید کو آبروبخشی، عربی وفارسی پر بھرپور اور کسی قدر مغربی تنقید نگاری پر بھی ان کی نگاہ تھی اس سرمائے کا جائزہ لے کر انہوں نے ادبی اور عملی تنقید کے متعدد نمونے پیش کیے۔ موازنہ انیس ودبیر اور شعرالعجم ان کی تنقید نگاری کے بہترین نمونے ہیں، ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر عبارت بریلوی نے لکھا ہے:

> "شبلی کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے مسلم ہے ان کی نظر میں وسعت اور گہرائی ہے جدت اور اپج ہے اور ان کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں، تنقید اور ادبی تجزیے کے میدان میں وہ کسی سے کم اہمیت نہیں رکھتے تھے ان کے جمالیاتی ذوق کی بلندی ہر مشکل میں حسن احساس کی صلاحیت اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعے نے ان کو اس مرتبے پر پہونچادیا ہے جس پر ان کے زمانے میں کوئی نہیں پہنچ سکا۔"[2]

کلامی ادب: علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم علامہ شبلی کی سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات اور ان کی متکلمانہ بصیرت کے نمونے ہیں۔ یہاں ان کی قدروقیمت سے قطع نظر محض یہ عرض کرنا ہے کہ شبلی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اردو میں کلامی ادب کا آغاز کیا۔[3] واقعہ یہ ہے کہ شبلی سے پہلے اور شبلی کے بعد اردو میں کوئی ایسا مصنف اور اہل قلم نظر نہیں آتا، جس نے اس قدر خشک موضوع پر اپنی تمام تر ادبی رعنائیوں کے ساتھ علم الکلام پر چار اہم اور معرکہ آرا کتابیں لکھی ہوں، یقیناً یہ شبلی کا عظیم

۱۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر ص ۸۹، پٹنہ ۱۹۸۳ء ۲۔ اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۸۷ ۳۔ شبلی ایک دبستان ص ۱۱۳، ڈھاکہ

الشان کارنامہ ہے۔

فارسی ادب: فارسی شعروادب پر جس قدر باریک اور گہری نظر علامہ شبلی کی ہے، ان کے معاصرین اس سے محروم ہیں، آزاد اور براؤن نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی اپنی بیش کاوشیں پیش کیں، تاہم وہ شبلی کے صحیفہ حسن وعشق شعرالعجم کے ہم پلہ بھی نہیں قرار دی جاسکتیں۔ شعرالعجم نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ ایک صدی بعد بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور آج تک خود ایران میں بھی اس پائے کی کتاب نہ لکھی جاسکی، یہی وجہ ہے کہ ایران وافغانستان میں اس کے کئی فارسی ترجمے ہوئے، اردو کی یہ کتاب نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران وافغانستان کے اہل علم وادب کی آنکھوں کا اب تک نور بنی ہوئی ہے۔

موازنہ انیس ودبیر: موازنہ انیس ودبیر جس میں مرثیہ کی ابتدائی تاریخ اور اردو کے دو ممتاز مرثیہ نگاروں یعنی انیس ودبیر کے مراثی اور شاعرانہ کمالات کا موازنہ ہے، شبلی کی ایک منفرد کاوش ہے۔ اسی سے انیس کی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں میں قائم ہوا، اردو میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں خود موازنے کے جواب میں کئی کتابیں سامنے آئیں، تاہم موازنے کو جو مقبولیت ملی وہ کسی اور کے نصیب میں نہ آسکی۔

سیاسی ادب: ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات پر علامہ شبلی کی بڑی گہری نظر تھی۔ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت، ظلم وجبر، ان کے عزائم اور استعماری کوششیں جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا، اس سے وہ بہت دل برداشتہ تھے۔ ان کی سیاسی نظموں میں اسی کرب کا اظہار ہے :

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض خستہ جاں کب تک

ملکی حالات اس سے بھی زیادہ ابتر اور دگرگوں تھے، انگریزوں کے تمام ظلم وجبر کے باوجود مسلمان مختلف الخیال اور مختلف الرائے تھے چنانچہ علامہ شبلی نے قومی سیاست کو قابل اصلاح قرار دیا اور متعدد مضامین لکھے۔ اس سلسلے کا ان کا اہم مضمون مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ ہے، جس میں مسلمانوں کی سیاست، حکومت نواز پالیسی مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کے مضر اثرات، سیاست کی صحیح اسکیم، مسلمانوں کے سیاست کی خامیاں، ہندو مسلم اتحاد اور مسلم لیگ کی سیاست جیسے اہم نکات کا ذکر ہے۔ یہ مضمون بقول مولانا سید سلمان ندوی، ''اس قدر مدلل اور پر جوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا''۔[1]

سیاسیات اس عہد کا عام موضوع تحریر تھا تاہم علامہ نے جس بلند ادبی اسلوب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی اس لئے ہم اسے سیاسی ادب کا بھی نام دے سکتے ہیں۔

مکتوباتی ادب: اردو کے مکتوباتی ادب میں بھی علامہ شبلی نے بڑا اضافہ کیا، انہوں نے اپنی ۳۲ رسالہ علمی زندگی میں احباب ومعاصرین کو بے شمار خطوط لکھے جنھیں مولانا سید سلمان ندوی نے دو حصوں میں مرتب کر کے شائع کیا، بمبئی کی دو خواتین کے نام شبلی نے جو خطوط لکھے تھے انھیں امین زبیری نے شائع کیا، ان کے علاوہ ان کے متعدد مکاتیب جو بعد میں دریافت ہوئے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نقوش لاہور اور ادیب علی گڑھ اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ حیات شبلی ص ۶۱۴

غالب کے مکتوبات نے اصلاً اس صنف ادب کو دوام بخشا۔ ان کے بعد مکتوباتی ادب میں علامہ شبلی ہی کے خطوط ادب وانشا کا نمونہ ہیں۔ خطوط غالب کے امتیازات اور خصوصیات کے پس منظر میں اگر شبلی کے مکاتیب کا جائزہ لیا جائے تو وہ مرزا غالب سے کم مرتبہ نہیں، بلکہ بعض حیثیتوں سے ان کی اہمیت اور زیادہ ہوجاتی ہے۔ مثلاً غالب کے مکاتیب میں ان کی زندگی، ان کا عہد اور بعض سیاسی حالات وواقعات کے علاوہ اور کوئی منظر نظر نہیں آتا جبکہ مکاتیب شلی میں شبلی کی زندگی اور ان کے عہد کے علمی، ادبی، تاریخی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی حالات کے ساتھ عالم اسلام کے مسائل، یورپ کی چیرہ دستیاں، مستشرقین کی اسلام دشمنی غرض ان کے عہد کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے، جس کی مدد سے ہم اس عہد کی ایک تاریخ قلم بند کرسکتے ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے اسی بنیاد پر مکاتیب شبلی کو قومی اعمال نامہ قرار دیا ہے۔[1]

سیرت نگاری: سب سے آخر میں علامہ شبلی آستانہ نبوت پر پہونچے اور شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر پیش کی، جس کو دنیا سیرۃ النبی کے نام سے جانتی ہے۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرت نگاری کی ایک طویل تاریخ ہے اس کے باوجود شبلی نے اس میدان میں جو کچھ کر دکھایا وہ کسی معجزے سے کم نہیں، ایک بڑے اہل قلم نے لکھا ہے کہ یہ اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرہ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں، منفرد حیثیت رکھتی ہے حتی کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی۔[2]

۱۔ تنقیدیں ص ۵۲ ۲۔ معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸

اس دعوے پر بعض اہل قلم نے اعتراض وارد کیا ہے اور اس کی تردید میں خود سیرۃ النبی پر متعدد اعتراضات کیے ہیں۔ تاہم معترضین کو بھی اس کی انفرادیت کا اعتراف ہے۔[1] اور کم از کم اتنا تو طے ہے کہ اردو کے سارے ذخیرہ کتب سیرت میں سب سے زیادہ بلند پایہ کاوش علامہ شبلی ہی کی ہے۔ یقیناً اردو کو اس گراں بہا تصنیف پر افتخار حاصل ہے۔

اسلوب نگارش: اردو کے عناصر خمسہ میں انشا پرداز کے لحاظ سے محمد حسین آزاد سب سے بلند مقام پر فائز ہیں، شبلی نے لکھا ہے کہ وہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے، اس طرح دوسرے عناصر کی نثر بھی اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ کم رتبہ نہیں تاہم شبلی کا اسلوب نگارش سب سے منفرد، جداگانہ بلکہ عناصر اربعہ کے اسلوب کی تمام خصوصیات کا مجموعہ ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب نے بڑی مقبولیت پائی اور اس کی تقلید کی گئی۔ قوت، جوش، تکرار، ایجاز واختصار، طنز وتعریض، شعریت، نغمگی علامہ شبلی کے اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں[2] لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علمی وادبی اور تحقیقی وتنقیدی موضوعات میں بھی اس کی دلکشی اور ادبی رعنائی قائم رہتی ہے۔ جبکہ دوسرے اسالیب میں یہ خوبی نہیں۔ بہر حال علامہ شبلی کے اسلوب نے بھی اردو کو ایک قابل فخر زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

شاعری: علامہ شبلی ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر بھی تھے، مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ایک مختصر کلیات ان کی یادگار ہے۔ اگر چہ شاعری میں علامہ شبلی کا وہ مقام نہیں جو نثری ادب میں ہے، تاہم ان کا شعری سرمایہ بہت اہم اور وقیع ہے بلکہ

۱۔ مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار از ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ۲۔ سعید انصاری، مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز، ص ۸ لکھنؤ ۱۹۳۴ء ۳۔ رشید اور انکے ناموررفقا ص ۱۸۵۔ ۱۹۵

واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخی اور سیاسی نظموں کا باقاعدہ آغاز کیا[1] اور مؤرخانہ شعور و آگہی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر سیاسی نظموں کو بانگ درا اور ضرب کلیم بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے علامہ شبلی کی نظموں کو اردو شاعری میں ایک نئی چیز بتایا ہے،

فنی لحاظ سے بھی ان کی شاعری میں پختگی اور مشاقی پائی جاتی ہے اور جوش وجذبات کے لحاظ سے تو وہ آب اپنا پرتو ہے، شہر آشوب اسلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض خستہ جاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

حرم کی سمت بھی صیاد افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک

۱۔ کلیات شبلی، مقدمہ ص ۱۸

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

بحیثیت مدیر: علامہ شبلی در سائل محمڈن اینگلو اورینٹل کالیج میگزین علی گڑھ اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے مدیر رہے ان رسائل کے ذریعہ بھی انہوں نے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی، ان کے مشمولات سے ان کی متنوع خدمات کا اندازہ ہوتا ہے خاص طور سے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں علامہ شبلی نے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھے بلکہ اردو کے چند نامور ترین اہل قلم کی تصنیف و تالیف کے لئے تربیت بھی کی۔ ان میں مولانا سید سلمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ابوالکلام کی نثر سید سلمان ندوی کی تحقیقات علمیہ اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کاوشیں شبلی ہی کی بدولت اردو کا حصہ بنیں۔

انجمن ترقی اردو: ۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ چنانچہ اسے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی، متعدد منصوبے بنائے اہل قلم کو اس کی طرف متوجہ کیا، اشاعتی منصوبہ بنایا اور اس وقت کے ماحول میں اس ایک فعال ادارہ بنا دیا، ۱۹۰۵ء میں اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے علیحدہ ہو گئے[1] تاہم قلیل مدت میں انہوں نے انجمن اردو کی جو خدمت کی اسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

دارالمصنفین: علامہ شبلی کی آخری یادگار دارالمصنفین ہے، جس کی خدمات کا

۱۔ شبلی کی علمی و ادبی خدمات ص ۳۰۵۔۳۰۹، دہلی ۱۹۹۶ء

دائرہ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے اس نے علامہ شبلی کے تخیل اور منصوبوں کے مطابق اب تک دوسو سے زائد بلند پایہ کتابیں شائع کر کے علم وادب کے سرمائے میں نہایت وقیع اضافہ کیا ہے، جو علامہ شبلی ہی کا فیضان ہے۔

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلی نے نہ صرف دامن اردو کو موتیوں سے بھر دیا بلکہ اسے نئی جہتوں اور بلندیوں سے آشنا کیا اور اسے ایک علمی زبان کا درجہ عطا کیا، اس لائق بنا دیا کہ ہم دنیا کی بہترین زبانوں کے مقابلے میں اسے فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

ڈاکٹر عبدالرشید ندوی

خطباتِ آزاد کا دعوتی رنگ

قرآن کریم نے زبان وبیان کی تاثیر کو تسلیم کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے بے جا استعمال کو "مایلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید" کے ذریعے لگام بھی لگائی ہے۔ زبان کی سحر انگیزی اور جادوانی کا اعتراف اس نے کئی جگہ کیا ہے اور چشم فلک نے دیکھا کہ روئے زمین پر رونما ہونے والے انقلابات میں زبان وبیان ہی کو زیادہ دخل رہا ہے بلکہ آج بھی اس کی اہمیت مجموعی طور پر زمانہ قدیم سے کم نہیں ہے۔

خطابت دنیا کا قدیم ترین ذریعہ ابلاغ ہے، جو متحارب قبائل کے درمیان صلح کرانے یا غیر متحارب کو انتقامی جذبہ کے تحت جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ تمام انبیاء کرام اور قابل قدر ہستیوں نے گم کردہ راہ انسان کو جادۂ مستقیم پر لانے کے لیے اس کو اپنایا، اور تمام تر رشد وہدایت کی تلقین اسی کے ذریعہ کرتے رہے، تمام آسمانی کتابوں میں خطبات کا زور اور اس کا رنگ نظر آتا ہے، کیونکہ خطیب کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سامعین کو اپنا ہم خیال بنائے یا انہیں کسی رائے یا تجویز پر متفق کرے، اس کے لئے موضوع کا انتخاب نہایت اہم ہے۔ خطیب کو چاہیے کہ وہ موضوع

کی اہمیت کو خوب سمجھ لے اور اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جائے، مافی الضمیر کو نپے تلے الفاظ میں مدلل طور پر برجستہ اور موثر طریقے سے پیش کرے۔ کیونکہ بقول افضل حسین صاحب :

''خطابت میں ادب کی چاشنی کلام کی آفرینی میں غیر معمولی اضافہ کر دیتی ہے، حسین و مؤثر کلام ایسا مضراب بن جاتا ہے جس سے خوابیدہ نغمے پیدا کئے جاسکتے ہیں، افراد کے لطیف احساسات کو اجاگر اور قوموں کے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑا جاسکتا ہے، پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹا جاسکتا ہے تو مموله کو شہباز سے لڑانا بھی آسان ہے شیشے کو اگر سنگ سے ٹکرایا جاسکتا ہے تو رگ گل سے بلبل کے پر بھی باندھے جاسکتے ہیں''۔

بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی، اخلاقی دینی انحطاط اور زوال کا زمانہ رہا ایسے وقت میں ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنی شاعری، مولانا محمد علی جوہر نے اپنے کامریڈ اور ہمدرد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے الہلال، البلاغ اور خطابت کے ذریعہ اپنی محنت و مساعی سے ملت اسلامیہ کو ایک طویل خواب سے جگانے میں اہم کردار ادا کیا چنانچہ اس دور میں انکی خطابت نے صور اسرافیل کا کام کیا۔

خطابت ایک فن نہیں بلکہ کئی فنون کا مجموعہ ہے۔ وہ شاعری بھی ہے انشا پردازی بھی، علم بھی ہے ادب بھی، بذلہ بھی ہے استدلال بھی اور مصوری بھی ہے موسیقی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے مجمع اکائی میں تبدیل ہو جاتا اور ہزاروں دماغوں میں سمع و بصر کی وحدت قائم ہو جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ خطابت کا ملکہ وہبی ہوتا ہے، لیکن خطابت محض ملکہ ہی نہیں مواد کا بھی نام ہے اور مواد سب کسبی ہوتا ہے۔ اس لیے خطابت علم چاہتی ہے،

لیکن اس کو دلکشی زبان عطا کرتی ہے اور علم وزبان کا خطاب میں ڈھلنا پے در پے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔شورش کاشمیری نے مولانا آزاد کے خطیبانہ بانکپن کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا آزاد میں محمد علی کی مبارزت، ظفر علی خاں کی مقاومت، عطاء اللہ شاہ کی شحامت اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے لیکن وہ ہر رعایت سے اتنے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا ہالہ تھی، وہ برعظیم میں فن کی رعایت سے اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے اور خطابت کے معنوی اوصاف میں کوئی ان کے ہم پلہ نہ تھا وہ ایک ہی شخص تھے جن میں قیادت وخطابت کی رعایتوں سے ایک نابغۂ روزگار انسان کی تمام خوبیاں بیک وقت اکٹھا ہوگئی تھیں وہ قدیم وجدید کے محاسن کا امتزاج تھے سیاست داں، مدبر، مفکر، راہنما، ادیب، صحافی، خطیب مفسر اور کیا کچھ نہیں تھے ان کے محاسن اتنے عظیم تھے کہ ہر حسن ان پر فخر کرتا تھا ان کے علم کی بے پناہی نے انہیں عوام سے الگ کر دیا تھا وہ شمع محفل کی طرح سب سے جدا اور سب کے رفیق تھے''۔

مزید لکھتے ہیں:

''آزاد خطابت کی ہر ادا میں ڈھلے ہوئے تھے، زبان لونڈی، بیان خانہ زاد، فصاحت پیش کار، بلاغت خدمت گار، مطالعہ بیکراں، مشاہدہ غیر مختتم، تجربہ ہر لحظہ، عربی جیب کی گھڑی، فارسی ہاتھ کی چھڑی، اردو محبوبہ، دماغ انسائیکلو پیڈیا، زبان شمع، سلامت لو، ذہانت معجزانہ،

ظرافت ملیح جیسے بلور کی پیشانی پر سیندور کا ٹیکا، اسلوب بے مثال، آواز پاٹ دار، لہجہ نستعلیق، الفاظ کا ٹانکہ ٹانکہ بولتا تھا، اشارات چاند پہ ہالے کی طرح، استدلال آنکھ میں بینائی کی مانند، تمثیلات ہم رکاب، انفرادیت اس حد تک کہ اس کا افصح نام ابوالکلام تھا''۔

مولانا آزاد نے اوائل عمر ہی میں علم ومطالعہ کی وادیاں طے کرلی تھیں۔ وہ موروثی خطیب تھے۔ اپنی عمر کے تیرہویں سال میں اکابر کے لیے موجب حیرت بنے، انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پہلی بار خطاب کیا تو مولانا االطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی محوِ حیرت ہوگئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کہا تقریر خوب رٹی ہوئی ہے، اس ریمارک پر مولانا نے اعلان کیا کہ ڈپٹی صاحب جو عنوان تجویز فرمائیں میں اسی اجلاس یا اگلے اجلاس میں اسی موضوع پر تقریر کروں گا۔ ڈپٹی صاحب نے موضوع تجویز کیا مولانا نے تقریر کی تو مجمع لوٹ پوٹ ہوگیا، علامہ شبلی نے مولانا کے انہی کمالات پر کہا تھا''تمہارا دماغ عجائب روزگار میں سے ایک ہے''۔

مولانا آزاد کے خطبات میں دعوتی رنگ ہر جگہ چمکتا اور نکھرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تقاریر سے ملت اسلامیہ کے مردہ دلوں میں جان ڈالنے، سرد لاشوں میں جھرجھری پیدا کرنے، سوتوں کو جگانے، جاگتوں کو چلانے اور چلتوں کو دوڑانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بے شک ان کے خطبات سے ایمان کو تازگی، روح کو بالیدگی، فکر کو روشنی اور یقین کو پختگی نصیب ہوئی۔

ملاحظہ ہو ان کے خطبے کی ایک جھلک:

''جو کھونا نہیں جانتے وہ پانے کا مزہ کیوں کر لے سکتے ہیں، جس نے کبھی کانٹے کی چبھن نہیں دیکھی وہ تلوار کے زخموں کی روداد کیوں کر

بتا سکتا ہے، دریا میں اتر کر ہی تیرنا آسکتا ہے، تم یہ چاہو کہ پاؤں گیلے نہ ہوں، پانی بدن کو چھوئے نہیں اور کناروں پر کھڑے کھڑے تیرنا سیکھ لو تو یہ ممکن نہیں، اسلام کی سربلندی کا راز ساحلوں پر کھڑے ہو کر دریاؤں کا پیچ وتاب دیکھنے میں نہیں اس کی سرفرازی کے لئے تمھیں طارق کی طرح اپنی کشتیاں جلانا ہوں گی کچھ کھو کر ہی پاسکتے ہو"۔ (تذکرہ)

ان کے ایک اور خطبہ کی سحر انگیزی کا ایک اور رنگ

"بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان اور اسباب کار فراہم نہیں لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا، اگر سروسامان نہیں تو اسے اپنے ہاتھ سے تیار کروں گا اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہئے اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہئے، اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہئے، اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہئے اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ راہ صاف نہیں کرتے وہ زمانہ کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے وہ زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لوں وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کروں"۔ (تذکرہ)

مولانا آزاد دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک جان سمجھتے۔ مشرق وسطی کے حوادثات میں جب ترکوں کی پسپائی ہوئی تھی اور یہ خبر جب ہندوستان پہنچی تو مولانا کی زبان شعلے برسانے لگی۔ کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں انہوں نے کہا:

''اے عزیزان ملت اور بقیہ ماتم زدگان اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروان اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں، اگر آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک پیرو توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ایسی زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ قسم ہے خدائے اسلام کی کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے کیونکہ ملت اسلامیہ ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح ہیں''۔ (الہلال ۶ رنومبر ۱۹۱۲ء)

دعوت دینیہ اور تعلیمات اسلام کا اثر ہمیں ان کے خطبات میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مختلف مواقع پر مختلف پیرایۂ بیان میں اس دعوت کو پیش کیا اور زور دیکر کہا کہ جب اتباع اور اعتصام بحبل اللہ المتین کی شمعیں خود ان کے یہاں فروزاں ہیں تو ان کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت۔ انہوں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بتلایا کہ مسلمانوں کا سارا زوال اور انحطاط صرف اس ایک غفلت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کو چھوڑ دیا۔ وہ اس وقت تک ترقی کرتے رہے جب تک قرآن کی اشاعت وتبلیغ ان کا قومی عشق رہا۔ ان کی تاریخ میں جو کچھ بھی ہے صرف اسی کے لئے ہے۔ انہوں نے اپنا وطن چھوڑا تو اسی کے لئے، عزیز واقرباء سے مہجور ہوئے تو اسی کی خاطر،

مال و دولت لٹایا تو اسی کی یاد میں، ان کی تلواریں بے نیام ہوئیں تو اسی کو پھیلانے اور ان کی گردنوں سے خون بہا تو اسی کے عشق میں۔ کیونکہ ان کی زندگی کی صدا یہ تھی" ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین۔"

اسی لئے وہ مسلمانوں کو بزدلی سے ڈراتے اور عزم و استقلال کا پیکر بنے رہنے کی دعوت یوں دیتے ہیں:

"آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیروں سے کانپتے ہو۔ یاد کرو کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا، گھٹاؤں کا طوفان کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں وہ آخر تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں کوندیں تو ان پر مسکرائے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو رخ پھیر لیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا لوٹ جاؤ۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایماں نہ تھا۔

عزیزو میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو سال پہلے کا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا"۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

حسین امین

اردو زبان وادب کے ارتقاء میں
مولانا دریابادی کی صحافتی خدمات

زبان وادب کے ارتقاء کی کوئی طے شدہ مدت نہیں ہے۔ نہ اس کی کوئی آخری منزل ہے۔ اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ آئے دن نئی ڈکشنریاں شائع ہوتی ہیں جن میں نئے الفاظ، نئی اصطلاحات، نئے نعرے اور نئے محاورے شامل کئے جاتے ہیں۔ ارتقاء کا مطلب ہی یہی ہے کہ زبان وادب میں نئے اضافے ہوں۔ اردو زبان کی بقاء کا بھی اگر چہ بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن یہ مدارس دینیہ میں جن کی بدولت اردو زبان برقرار ہے، ہرا بھرا ہے اور رہے گی۔ گویا ادب اور زبان کے ارتقاء میں علماء کے اہم رول کے ساتھ مدارس کا بھی بہت بڑا رول ہے، جس کی بدولت زبان بچی ہوئی ہے۔

صحافت میرا شوق بھی ہے اور میرا مشغلہ بھی، اس لئے اصل موضوع سے تھوڑا سا انحراف کرنا چاہوں گا، حالانکہ یہ ایسا انحراف بھی نہیں ہے۔ صحافت ادب ہی کی ایک صنف ہے۔ اس کی عمر تقریباً ۱۸۳ برس کی ہے جو اردو زبان کی عمر سے بہت کم ہے، یہ ضرور ہے کہ صحافت کی دوسری شکلیں پہلے سے موجود تھیں۔ ۱۸۲۲ء میں اخباری صحافت

کا آغاز ہوا جس کے بعد سے ادب کی مختلف اصناف نے تیزی سے ترقی کیں، شعری اور نثری تخلیقات اخباروں میں شائع ہونے لگیں، محاوروں اور اصطلاحات سے عام لوگ باخبر ہونے لگے۔ صحافت کے ذریعہ بھی زبان وادب کے ارتقاء میں وہ صحافی خدمات انجام دیتے چلے آرہے ہیں جو علماء کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایسے صحافیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن ان میں جو نام بہت نمایاں ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام شامل ہیں لیکن ان کی صحافت ایک خاص مقصد کے لئے تھی اور بس لیکن ان کے قلم سے جو تحریر نکل گئی مقصد کے بیان کے لئے جو محاورے، الفاظ وغیرہ استعمال کئے گئے وہ اردو زبان کی ترقی میں چار چاند لگا دینے کے مصداق تھے۔ بہر حال صحافت کے ذریعہ بہت سے علماء نے زبان وادب کی اپنے قلم سے شاندار خدمت کی۔ متعدد دینی اداروں نے جریدے شائع کئے جو آج بھی جاری ہیں ان میں عالم اسلام کا مشہور علمی اور اسلامی ادارہ ندوۃ العلماء شامل ہے۔ جس کا وصف یہ ہے کہ عربی، انگریزی، ہندی اور اردو میں جریدے شائع کرتا ہے جس میں انتہائی معیاری مضامین ہوتے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا واضح رشید اور خود مولانا رابع صاحب نہ صرف اپنی تصنیفات کے ذریعہ بلکہ صحافت کے ذریعہ بھی زبان وادب کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں مولانا منظور نعمانی ایک ممتاز اہل قلم تھے جنہوں نے صحافت کے ذریعہ دین و زبان اور ادب کی خدمت کی۔ ہندوستان بہت وسیع ملک ہے، اس ملک کے تمام علماء کی خدمات چند صفحات میں سمونا مشکل کیا ناممکن ہے۔

زبان وادب کی خدمت کرنے والے علمائے کرام کی فہرست میں مفسر، مصنف، ناقد، ممتاز اہل قلم اور صاحب طرز صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بہت نمایاں

ہے جن کو صرف اردو پر ہی نہیں عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ لیکن اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ان کی خدمات لا جواب کہی جاسکتی ہیں۔ مولانا دریابادی کے بارے میں ان کے زبردست مداح مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا یہ تأثر ہی ان کی شخصیت کے تعارف کے لئے کافی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی نادرۂ روزگار اور صاحب کمال شخصیتوں میں سے ہیں۔ ایک ادیب و صاحب قلم کی حیثیت سے بھی قرآن کے ایک مفسر و خادم کے لحاظ سے یعنی قدیم و جدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی اور اپنے وقت اور صلاحتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہونچانے والے انسان کی حیثیت سے بھی ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز ناقد و طنز نگار کی بنا پر بھی وہ ہر طرح قابل قدر اور اعزاز کے مستحق ہیں۔ مولانا علی میاں نے مولانا دریابادی کے بارے میں ان تأثرات کا اظہار فروغ اردو لکھنؤ کے مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر میں اپنے مضمون میں کیا ہے جس میں انہوں نے مولانا کے سفرنامہ بعنوان سفر حجاز کے بارے میں یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں امتیاز خاص رکھتا ہے۔

مولانا دریابادی ایک تنوع الکمال شخصیت کے مالک تھے جن کی تحریروں میں ایسا زور ملتا ہے جو قاری کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ مولانا کی نگارشات کی طویل فہرست ہے جس میں مختلف موضوعات ہیں۔ صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ کے روح رواں مولانا نعیم الرحمان صدیقی ندوی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''کتاب زندگی کے چند ورق'' کے عنوان سے ایک کتابچے میں وہ فہرست شائع کی ہے جس کے موضوعات یوں ہیں قرآنیات و متعلقات، ادب و انشاء، آپ بیتی، سوانح، فلسفہ و نفسیات، خطبات و تقاریر، تراجم و تالیفات، مرتبات و مکتوبات، سفرنامے، انگریزی کی کتابیں اور ان نگارشات کی

بھی فہرست ہے جو مولانا کے بارے میں دوسروں کی ہیں۔

مولانا دریابادی کی صحافتی خدمات کا سلسلہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا جب انہوں نے لکھنؤ سے ہفت روزہ ''سچ'' شائع کیا جو آخری عمر تک صدق اور صدق جدید کے نام سے نکالتے رہے۔ اس سے قبل بھی وہ متعدد پرچوں اور اخبارات سے منسلک رہے تھے ہفت روزہ سچ کا جو اصلاحی صحیفہ کی حیثیت بھی رکھتا تھا مقصود صحیح تھا۔ ترویج اسلامی تعلیمات کی تبلیغ، معاشرہ کی اصلاح، خلافت کے احیا کی کوشش ملک کی آزادی میں حصہ لیا، باطل نظریات کی بیخ کنی، فرنگی تمدن اور مغربی سیلاب کو روکتا تھا۔ مولانا کا شہرۂ آفاق کالم ''سچی باتیں'' تھا جو اتنا مقبول ہوا کہ بیسویں صدی کی اردو صحافت میں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ اس کالم کا سلسلہ مولانا کی وفات سے ۶ رجنوری ۱۹۷۷ء کچھ عرصہ قبل تک جاری رہا۔ یہ کالم دینی، اخلاقی، علمی، ادبی، فکری، تہذیبی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہوتا تھا۔

سچی باتیں کے عنوان سے صدق فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی نے ایک کتاب مرتب کی ہے جس کی جلد اول منظر عام پر آچکی ہے۔ مولانا دریابادی کی تحریر غضب کی ہوتی تھی۔ اور ان تحریروں میں حافظ کے اس قول کے بموجب الفاظ کی نشست ملتی ہے کہ ؎

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد

مولانا کی تحریروں میں الفاظ اور محاوروں کا استعمال اس انداز میں ہوتا ہے کہ تحریر میں زبردست روانی پیدا ہوجاتی ہے۔ ان تحریروں کے ذریعہ انہوں نے زبان وادب کے ارتقاء میں ہمیشہ حصہ لیا۔ انہوں نے ضرورت کے لحاظ سے محاورے بھی ڈھالے جیسے کہ وہ فرنگی حکومت کو ''یاجوجی'' حکومت کہتے تھے۔ ''سفر حجاز'' میں ان پر

جو کیفیت طاری ہوئی ان کا ذکر جن الفاظ میں کیا اور جن محاوروں کا سہارا لیا وہ اردو زبان وادب کے معیار کو نئی بلندیاں بخشتے ہیں۔ مولانا دریابادی کو مولانا محمد علی جوہر کی رفاقت میں کام کرنے کا موقع ملا چنانچہ انہوں نے محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند اوراق کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس سے ان کے فن سوانح نگاری میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے صرف اپنی یادداشتوں کی بنیاد پر مرتب کی ہے جس میں انہوں نے ادبی صلاحیتوں کو ثابت کر دیا ہے۔

لکھنؤ میں اردو نیوز پیپرس ایڈیٹر کانفرنس کے موقع پر جو غالباً ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی اور جس میں وزیر اعظم اندرا گاندھی مہمان خصوصی تھیں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کا خیر مقدم لکھنؤ کی زبان میں کیا تھا۔ اس میں انہوں نے اردو صحافت کا جائزہ لیا تھا۔ ایسی خیر مقدمی تقریر اس سے پہلے شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ ادب کے ارتقاء میں صحافت کا اہم رول ہوتا ہے۔

مولانا نے تفسیر ماجدی میں عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے جو ان کے صحافتی مزاج کی دین ہے۔ انسانی زبان یقیناً زبان وادب کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ مولانا کی تحریروں میں غضب کا توازن ملتا ہے اور مختصر نگاری میں تو ان کو ملکہ حاصل تھا۔ الغرض مولانا نے اپنے اس خاص انداز نگارش سے زبان وادب کے ارتقاء میں اپنا رول ادا کیا ہے۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

عمید الزماں کیرانوی
دیوبند

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ
اور
خطابت میں ان کا حصہ ومقام

واقعہ یہ ہے کہ فن خطابت (بالخصوص زیر بحث اردو زبان میں فن خطابت) میں علماء کرام کا حصہ بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ تفصیلی جائزے کے بغیر قطعیت کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن بادی النظر میں مقررین اور خطیبوں کی صف میں علماء دوسروں کے مقابلہ تعداد اور امتیاز دونوں ہی اعتبار سے غالب وفائق نظر آتے ہیں۔

ماضی قریب میں جب ہم صف اول کے خطیبوں کی تلاش میں حافظہ پر زور ڈالتے ہیں تو سطح ذہن پر جن شخصیات کے اسماء گرامی فوری طور پر ابھر کر آتے ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سعید احمد دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا قاری محمد طیب، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہم اللہ۔

ان مقررین اور خطیبوں میں سے ہر ایک کا اپنا الگ مرتبہ و مقام ہے اور ہر ایک کی اپنی خطیبانہ خصوصیات ہیں۔ یہ وہ خطیب ہیں جنہوں نے خطابت کے دامن کو وسیع بھی کیا ہے اور مزین و آراستہ بھی اور اس کو نئی جہات و ابعاد (Dimensions) عطا کر کے فن کی بلندیوں تک پہونچا دیا ہے۔

مذاکرۂ علمی کے لائق و محترم منتظمین کی جانب سے بطور مثال تجویز کردہ ''فن خطابت میں علماء کا حصہ'' کو اپنے عموم کے ساتھ جوں کا توں رکھنے کی صورت میں میرے لئے چونکہ مصروفیات اور کم مائیگی کے باعث نہ موضوع کے ساتھ انصاف ممکن تھا اور نہ ہی اس کی وسعتوں کو سمیٹنا، اس لئے میں نے اپنے عمل کو مختصر اور آسان بنانے کے لیے ضروری سمجھا کہ کسی ایک ہی شخصیت کو موضوع بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تھوڑا غور و فکر کیا گیا اور نتیجہ کے طور پر مذکورہ بالا عنوان کو ترجیح حاصل ہوگئی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی شخصیت گوناگوں اوصاف و امتیازات کی حامل تھی۔ انہوں نے اپنے ان اوصاف و امتیازات کو استعمال کرتے ہوئے دین و ملت کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ وہ علمی و عملی دونوں سطحوں پر سرگرم رہے اور دونوں ہی کے تعلق سے اپنی الگ تاریخ بنائی۔ دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام و انتظام کی گراں بار ذمہ داریوں اور اس میں شب و روز اشتغال اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی سرپرستانہ مصروفیات کے باوجود ان کا اشہب لسان و قلم اپنے معمول کی تیز رفتاری کے ساتھ زندگی بھر دوڑتا رہا۔ جس کے نتیجے میں ڈیڑھ سو سے زائد، علمی شہ پارے اسلامی مکتبات کی زینت بنے اور وہ آج تشنگان علم کی سیرابی و آسودگی کا ذریعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسی عبقری اور متنوع الجہات شخصیت پر اب تک بہت کم کام ہوسکا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی دینی و ملی

خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے دیوبند سے باہر متعدد علمی اکیڈمیاں قائم کی جاتیں۔ اردو کے علاوہ دوسری اہم زبانوں، عربی، انگلش وغیرہ میں آپ کی ان پر مغز اور اپنے موضوع پر نادر کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا اور ان کی اشاعت وتوسیع کی جاتی۔ یہ دارالعلوم دیوبند سے نسبت اور اس کے اکابر واسلاف سے عقیدت ومحبت رکھنے والے ہر فرد کا فریضہ ہے۔

اس وقت ان سطور میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی پہلو دار شخصیت کے صرف ایک پہلو ''خطابت'' پر کچھ اظہار خیال کرنا ہے۔ حضرت کی شخصیت کے تعلق سے یہ موضوع کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ ضرورت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر قلم اٹھانے سے قبل آپ کے کل یا بیشتر تقریری سرمایے کا مطالعہ کیا جاتا۔ اس پر تجزیاتی نگاہ ڈالی جاتی۔ اسی کے ساتھ اس قبیل کی دوسری اہم شخصیات اور ان کے مدون لسانی کارناموں کو پیش نظر رکھا جاتا۔ فنی تقاضوں سے بھی بحث کی جاتی اور نتائج پر گفتگو کی جاتی۔ اس طرح کے محاکے اور موازنے کے بعد ہی کسی شخصیت کا متعلقہ موضوع کے حوالے سے، امتیاز واضح ہو پاتا ہے۔ میں یہ اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی بے بضاعتی کے ساتھ ساتھ کثرت مشاغل کی بنا پر مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔

میں نے بنیادی طور پر (کتاب) ''خطبات حکیم الاسلام'' کو پیش نظر رکھا ہے، جس کی اب تک دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اسے حکیم الاسلام اکیڈمی دیوبند کی طرف سے مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری نے مرتب کیا ہے۔ میرے سامنے دارالکتاب دیوبند کا طبع کردہ نسخہ ہے۔ ان دس جلدوں میں مجموعی طور پر کل ۱۰۸ خطبات شامل ہیں۔ جن میں بعض تو خود ان کی زندگی میں تصنیف کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کی حیثیت باضابطہ اپنے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی ہے۔ ان میں ایک اہم تقریر وہ ہے جو

آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''انجمن اسلامی تاریخ وتمدن'' کی دعوت پر ''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر کی تھی۔ زیر نظر خطبات کے مجموعے میں یہ خطبہ یا تقریر چھٹی جلد میں تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تقریر کو اس وقت بھی کافی شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور آج بھی علمی حقائق و دقائق، رموز و نکات اور بصائر و عبر کے اقتباسات و واقعات سے اس کی سطر سطر پُر اور پڑھنے کے لائق ہے، اپنے منصب و شہرت کے اعتبار سے تقریر و خطابت حضرت قاری صاحب کی ضرورت تو تھی ہی بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ وہ لوگوں کی توقعات اور اصرار کے باعث ایک مجبوری بھی تھی۔ ملک و بیرون ملک اسفار کا سلسلہ زندگی کے اخیر کے سالوں تک جاری رہا اور شاید ہی کوئی سفر ایسا ہوتا ہو جس میں آپ کو تقریر بلکہ تقریریں نہ کرنی پڑتی ہوں۔ مولانا احمد سعید دہلوی نے آپؒ کے بارے میں کہا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتممین ثوابت تھے لیکن مولانا قاری طیب صاحبؒ سیارہ ہیں۔ (خطبات حکیم الاسلام ج ۶، ص ۳۵)

اس کے علاوہ ۲۰، ۲۲ رسالوں تک جامع مسجد دیوبند میں جمعہ کے دن تقریر آپ کا معمول تھا۔ مسلسل لکھتے اور بولتے رہنے کی وجہ سے، کہنا چاہئے کہ آپ کی معلومات و یادداشت آپ کی زبان پر رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریر کے دوران نہ آپ کو لکنت لگتی اور نہ آپ آدھی ادھوری بات یا حوالے کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ کئی کئی گھنٹے کی تقریر میں تکرار کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ حقائق و معارف اور اسرار شریعت کے بند اس طرح کھولتے چلے جاتے جیسے سب کچھ حفظ کر کے آئے ہوں۔ یہ سب آپ کی قادرالکلامی، قوت گویائی اور جودت طبع کا فیض تھا۔ بات بات میں نکتہ پیدا کرنا آپ کا خاص امتیاز تھا۔ ان کے خطبات کی بعض اور خوبیاں ہیں جیسے وہ اختلافی مسائل کو کبھی نہیں چھیڑتے تھے۔ ایسے کسی مسئلے پر انہوں نے شاید ہی کبھی کوئی تقریر کی ہو۔ گویا وہ

"تو برائے وصل کردن آمدی، نے برائے فصل کردن" کے داعیانہ نکتہ پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ بے سروپا قصوں کے بیان سے پرہیز کرتے اور ہمیشہ مستند روایات کے سہارے اپنی بات کو ثابت یا مدلل کرتے۔ ذیل میں ان کی بعض اہم خوبیوں پر بطور نمونہ الگ عنوانات کیساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

جداگانہ طرز

نثر کے تعلق سے مرزا غالب کا ایک اہم ادبی کارنامہ خود ان کے بقول مراسلے کو مکالمہ بنا دینا تھا۔ خطوط میں انہوں نے بالالتزام جو اسلوب اختیار کیا وہ روزمرہ کی باہمی گفتگو سے مشابہ تھا۔ اس ندرت اسلوب سے ادب کا ایک نیا نثری باب وا ہوا۔ حضرت قاری صاحبؒ کے تعلق سے بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے برجستہ اور فی البدیہہ تقریروں میں تحریر و تصنیف کا علمی رنگ بھر دیا۔ جنہیں صاحب تقریر کی زبان سے سنیے تو مکمل معنوں میں تقریر اور اگر انہیں زیب قرطاس کر دیا جائے تو مکمل معنوں میں ایک مقالہ اور ایک مضمون۔

یہ وصف اور رنگ اسی وقت اور انہی شخصیات کے یہاں پیدا ہوسکتا ہے۔ جنہیں زبان اور قلم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو۔ وہ دونوں کا شہ سوار اور دونوں ہی رمز شناس ہو۔ میں نے قاری صاحب کو خود بھی سنا ہے اور ان کے سننے والوں سے بھی آپ کے بارے میں سنا ہے۔ آپ کی زبان شستگی اور شائستگی کا نمونہ تھی۔ "نرم دم گفتگو" آپ کا شعار تھا۔ نہایت نپے تلے جملے۔ ہر قسم کے حشو و زوائد گنجلک پن سے پاک، فلسفیانہ مضامین کو بھی اسی سادگی اور پرکاری کیساتھ بیان کرتے ہیں۔ بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی بھی اس کا ایک حصہ ہے لیکن اس اعتدال کیساتھ کہ نام کو بھی آپ کی زبان و اسلوب میں رکاکت اور غیر سنجیدگی نہیں آتی۔ طویل سے طویل تقریروں میں بھی نہ تو تکرار کا گذر ہوتا

اور نہ ہی اصل لہجہ اور اسلوب میں کوئی فرق پیدا ہوتا۔ بس شروع سے اخیر تک دریا کی سی روانی کیساتھ آپ بولتے چلے جاتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"گھنٹوں بولتے تھے، زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ، کہیں کہیں ظرافت اور مزاح آمیزی، آواز از اول تا آخر یکساں، نہ زیر و بم، نہ اتار چڑھاؤ۔ مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق۔ اس لئے تقریر عوام و خواص دونوں کے کام کی۔" (۱)

عوام کی رعایت

علامہ ابن قیم جوزی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بارے میں عوام کو خطاب کرنے کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپؐ ہمیشہ مخاطبین کی ضرورت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق خطاب فرماتے تھے (**وکان یخطب فی کل وقت بما تقتضیه حاجة المخاطبین و مصلحتهم**) (۲) بسا اوقات ایک بڑا عالم اور لسان خطیب سامعین پر مطلوبہ اثر قائم نہیں کر پاتا۔ اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ موضوع تقریر کے مناسب انتخاب اور اس کے مشمولات کی ترسیل و تفہیم میں زبان و اسلوب کے اعتبار سے عام حاضرین کی رعایت نہیں ہو پاتی۔ اس سلسلے میں بہت سی عظیم شخصیات کا نام لیا جا سکتا ہے جو اپنے علم و فن میں نادرۂ روزگار و یکتائے زمانہ تھیں لیکن جہاں تک خطبات کے حوالے سے عوامی سطح پر ان سے استفادے کا تعلق ہے تو اس کا دائرہ نہایت محدود اور مختصر ہی رہا۔ حضرت علیؓ کا قول "**کلموا الناس علی قدر عقولهم**" تنبیہی طور پر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ اہم سے اہم علمی، دینی اور فکری موضوعات کو سہولت و جامعیت کے ساتھ اس طرح عام و خواص کے سامنے پیش فرما دیتے کہ استفادے کا معیار دونوں کے لیے کم و بیش یکساں ہوتا۔

اس کی سب سے بڑی مثال ان کی علی گڑھ کی مذکورہ بالا تقریر ہے۔ دیکھنے کا مقام ہے کہ سائنس اور اسلام کے درمیان تقابل و تجزیہ کے موضوع کو انہوں نے کس خوبی سے نبھایا ہے، کتنی آسان اور جامع تعبیرات اور مثالوں کے ذریعہ اس سخت اور سنگلاخ موضوع کو عوام کے لیے قریب الفہم بنادیا ہے۔ لیکن اس حوالے سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ آپ کا لہجہ عوامی تھا، عامیانہ نہ تھا، جس میں خطیبانہ ادائیں تو ہوتی ہیں لیکن علمی شوکت و وقار سے خالی اور خوش بیانی اور حسن ادا تو ہوتا ہے لیکن پر تکلف ادب آمیزی کے ساتھ۔ حضرت قاری صاحبؒ فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کے اندر تکلف و تصنع کا شائبہ نہ تھا۔ مجمع خواہ بڑوں کا ہو یا چھوٹوں کا اور خود چھوٹا ہو یا بڑا۔ قاری صاحبؒ کے لب ولہجہ اور انداز بیان پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے حضرت حکیم الاسلام کے انداز خطبات پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے:

> ''بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں۔ حضرت قاری صاحب کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش نہ خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسانی، نہ لہجہ نہ ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں۔ لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا۔ کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ و مستفید ہوتے تھے۔ مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے۔ جوش و خروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا

کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا، جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔"(۳)

ادبی اور لسانی ذوق

حکیم الاسلام کی تقریروں میں جابہ جا ایسے نمونے ملتے ہیں، جن سے ان کے ادبی ذوق و مزاج کا پتا چلتا ہے۔ ادب صرف خوبصورت الفاظ، نادر تشبیہات و استعارات اور شعری ترکیبوں کے استعمال کا نام نہیں۔ ادب کے ظاہری ڈھانچے کی تشکیل میں یہ ضرور معاون ہوتی ہیں لیکن اصل چیز جس سے "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت متکلم کے کلام میں پیدا ہوجاتی ہے۔ دراصل لفظوں کا موزوں اور برمحل استعمال اور ان کی وہ معنوی تہہ داری ہے، جو صرف سامعہ نواز ہی نہیں بلکہ دل نواز بھی ہوتی ہے، جس میں صرف "فردوس گوش" ہونے کا سامان نہیں ہوتا بلکہ قلب کو مہمیز کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ غالب کے اس مشہور مصرعے میں اسی کیفیت کے اظہار کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تاہم اگر لفظوں کے دروبست، جملوں کی ساخت، ترکیبات وتشبیہات کو ادب کی تعریف کے حوالے سے ذہن میں رکھیں تو اس کی مثالیں بھی حضرت حکیم الاسلام کے یہاں کم نہیں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

"صنائع وحرف کے سلسلے میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب و

غریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئروں کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آتی ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں۔" (۴) "ریل کی پٹریوں پر یہ دوطرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہیں.....لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے، جبھی تک طاقتور ہے، جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے لیکن اگر اس لوہے کو کہیں آگ چھو جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔" (۵)

"پانیوں کا سب سے بڑا گھر، بلکہ ابوالمیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ پیکر موجوں کا لگاتار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا کرہ زمین کو نگل جائے۔" (۶)

"گویا وہ ایک آگ جو سر نیچا ہی نہیں کرتی تھی، (دیا سلائی کی شکل میں) انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی رفعت و تعلّی خاک میں مل گئی۔" (۷) "گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی (بجلی کے تار) کی قید میں گرفتار ہے۔" (۸)

پندرہ اگست ۱۹۵۷ء کو یوم آزادی کے موقع پر اس موضوع پر آغاز تقریر کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں اس میں لسان و بیان دونوں کی قوت کس حد تک کارفرما ہے:

"یہ آزادی.....آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی، بلکہ

کتنے ہی صبر آزما دنوں..... کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہونچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل ہمیں بیک دم اور پرامن طریق پر اچانک شب کے بارہ بجے موصول ہو گیا لیکن وہ کتنے تاریک سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہونچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا کتنے ہی آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا.....۔"(۹)

خطبات حکیم الاسلام کے مرتب لکھتے ہیں کہ: ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب و لہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ "کیا بات ہے" پیش کیا کہ یہ انکار کے لیے بھی اور اقرار کے لیے بھی۔ استفہام کے لیے بھی ہے اور اخبار کے لیے بھی۔ داد و تحسین کے لیے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لیے بھی۔ مرتب موصوف لکھتے ہیں کہ ایک گھنٹہ تک قاری صاحب "کیا بات ہے" کی تشریح کرتے رہے اور مجمع آپ کے بیان کے سحر سے عش عش کرتا رہا۔(۱۰)

حضرت قاری صاحبؒ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان دونوں زبانوں میں بھی ضرورت کے وقت تقریر فرماتے۔ بالخصوص فارسی پر ایسے زمانے میں عبور جب کہ ہندوستان سے اس کی طنابیں کب کی اکھڑ چکیں، نیز شعر و شاعری سے فطری شغف اور اس کا ملکہ جس کی مثال "عرفان عارف" کے نام سے آپ کا شعری مجموعہ ہے یہی وہ سب صلاحیتیں تھیں جنھوں نے مل

کر آپ کے لسانی اور ادبی ذوق میں غیر معمولی نکھار پیدا کر دیا تھا۔

تاثیر کلام

خطبے کی تعریف لغت میں اس طرح کی گئی ہے کہ: ''وہ ایسے نثری کلام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ متکلم (خطیب) لوگوں کی جماعت کو خطاب کر کے اسے (اپنی بات کا) قائل بناتا ہے۔'' الکلام المنثور یخاطب به متکلم فصیح جمعا من الناس لاقناعهم۔ المعجم الوسیط) اقناع (Convincing) کا عمل بغیر کلام کی تاثیر کے ممکن نہیں۔ تاثیر اقناع کے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کے خطبات کی انتہائی اہمیت وافادیت ان کی اس خوبیٔ تاثیر میں مضمر ہے۔

یہ تاثیر کیسے اور کیوں کر پیدا ہوتی ہے؟ حضرت حکیم الاسلام خود اپنے لفظوں میں اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''متکلم کے قلبی جذبات مخاطب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ زبان تو محض آلۂ ظہور ہے۔ اس لیے قلب میں خوف وخشیت، تقوی و طہارت اور تعلق مع اللہ ہے تو معمولی درجہ کے مضمون سے سامعین متأثر ہوتے ہیں ورنہ اونچے درجے کے علوم و معارف بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔'' (۱۱)

قاری صاحب کی واعظانہ تاثیر کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ پہلی مرتبہ بمبئی ورود کے موقع پر ایک فرقے کے لوگوں نے حضرت قاریؒ کے خلاف اشتہارات چسپاں کرائے اور عوام الناس کو آپ اور علماء دیوبند سے متنفر کرنے اور اس جلسے میں شرکت سے دور رکھنے کے سارے حربے اور ہتھکنڈے آزمائے۔ مخالفین کا ایک گروہ وہاں جلسے کو منتشر اور پراگندہ کرنے کیلئے موجود تھا حتی کی اس میں بعض مسلح لوگ بھی اسٹیج سے کچھ فاصلے پر

بیٹھے تھے۔لیکن جب آپ کی تقریر ہوئی تو فضا یکسر تبدیل ہوگئی۔مجالس حکیم الاسلام میں اس اجتماع سے متعلق تحریر ہے کہ اس سے قبل کسی دیوبندی عالم کے دوسرے فرقے کی مسجد میں داخل ہوجانے پر مسجد دھلوا کر پاک کرائی جاتی تھی،لیکن اس اجتماع کے بعد نوعیت یہ ہوئی کہ جن لوگوں نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو پستول دکھا کر مرعوب کرنا چاہا تھا وہی لوگ حضرت حکیم الاسلام کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان لغویات سے توبہ کی اور اہل اللہ میں ہونے کی جدجہد میں مصروف ہوگئے۔ (۱۲)

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے تھے کہ:''ان کی ایک تقریر سے میری سال بھر کی سینکڑوں تقریریں تیار ہوجاتی ہیں۔''(۱۳)

ایک مرتبہ خیرالمدارس کے سالانہ جلسے کے موقع پر حضرت قاری صاحبؒ تقریر فرمارہے تھے،جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی موجود تھے۔کچھ دیر تک تو وہ خاموش ہوکر حضرت قاری صاحب کی تقریر سنتے رہے،پھر ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔بے اختیار نعرۂ تکبیر کہہ کر چند منٹوں کی اجازت لے کر مائک پر آ کھڑے ہوئے اور اپنے دوشعر حضرت قاری صاحب کی نذر کرتے ہوئے قاری صاحب کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بار بار اشعار کو پڑھتے رہے۔''(۱۴)

سامع کے دل موہ لینے اور دماغ کو قید کر لینے والی ایسی تاثیر کی مثالیں فی زمانہ کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔کیوں کہ خطابت کا فن عام طور پر پیشہ ورانہ ہاتھوں میں پڑ کر اپنی عظمت کھوتا جارہا ہے۔

بہرحال تقریر وخطابت کے بارے میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں ہے۔انہوں نے اس موضوع کو فن کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ وقت کی ضرورت اور اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے اختیار کیا۔اس لیے

فنی میزان پر انہیں پرکھنے کے بجائے ان کے اثرات ونتائج کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ تقریر تو دراصل ذہن وفکر کی دنیا میں انقلاب برپا کردینے اور اسے لوٹ لینے کا نام ہے۔

حوالے

۱۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، ایک شخصیت، ایک عہد، ایک تاریخ۔ از مفتی فضیل الرحمٰن ہلالی عثمانی ص:۶۱

۲۔ زادالمعاد

۳۔ خطبات حکیم الاسلام ج: ۶ ص:۳۷

۴۔ خطبات حکیم الاسلام ''سائنس اور اسلام'' ج:۶،ص:۳۷۴

۵۔ ایضاً ص:۳۷۴۔۳۷۵

۶۔ ایضاً ص:۳۷۲

۷۔ ایضاً ص:۳۸۳

۸۔ ایضاً ص:۳۸۵

۹۔ خطبات حکیم الاسلام ج:۹ ص:۲۴۷

۱۰۔ خطبات حکیم الاسلام ج:۶ ص:۳۵

۱۱۔ خطبات حکیم الاسلام ج:۸ ص:۴۷

۱۲۔ خطبات حکیم الاسلام ج:۸ ص:۴۹ مجالس حکیم الاسلام

۱۳۔ مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، ایک شخصیت، ایک عہد، ایک تاریخ ص:۶۱

۱۴۔ خطبات حکیم الاسلام ج:۶ ص:۴۲

سید ازہر حسین
دار العلوم ندوۃ لکھنؤ

الأستاذ المنفلوطی وخصائص کتابه "العبرات"

الفصل الأول

حالة مصر فی القرن التاسع عشر

الحالة السياسية

کانت مصر فی أواخر القرن التاسع عشر وأوائل القرن العشرین للميلاد قد توصلت إلى الحضيض الأسفل بالانحطاط السياسی والدينی والخلقی والاجتماعي لسلطة الخديوي إسماعيل الذی يحكم البلاد حكماً مطلقاً، ويود أن يفرض على مصر الحضارة الغربية وفی عهده نفوذ الأجانب يزداد فی أمور البلاد، وكانت حكومته كرة دائرة لاحول ولاطول حتى آلت الحكومة إلى ابنه توفيق، وكان أسوأ منه مما زاد الطين بلة وإنه قد شمر عن ساقه وشد المئزر لمقاومة حركة الإصلاح التی تخالف

الحضارة الأوربية وتكره تدخل الأجانب فى شؤون البلاد فساءت الأحوال بينهم وسادت الفوضى والانتشار فى البلاد، وعمت الفتن والاضطرابات وتوالت على الناس المحن والشدائد وسيطرعلى مرافق البلاد غريب الوجه واللسان١۔

الحالة الاجتماعية

هذا وأهل البلاد قد تفرقوا شيعاً وأحزاباً وظلوا فى كل حال رحماء على الأعداء الأجانب متباغين بينهم لم يكن لهم حزب يؤلف شملهم ويوحد صفوفهم وينقذهم من ورطات هذه المشاكل فسبب هذاالوضع تدهور الحالة الخلقية الدينية والاجتماعية للمسلمين فى البلاد فى تفشى حياة الخلاعة والمعاصى، ودخلت عادات قبيحة كثيرة فى حضارتهم وثقافتهم، فكان شرب الخمر أمراً عادياً، وكان السفورسائداً على جميع الحياة وعمت الملاهي ونوادي الطرب والغناء والرقص ودبت الضلالات والخرافات والبدعات فى تجاليدهم دبيب المشيب فى مجاليد الشباب٢۔

الحالةالثقافية

وأما الحالة الثقافية للبلاد فكانت مائلة إلى الحضارة الأوربية لأن الحضارة الأوربية أسدلت ستارها على مصر بعد حملة نابليون عليها بطريق علمي أدبيمن طريق مكتبة ومطبعة وتأثربها أهل البلاد وأعجبوابها إعجاباًكثيراً حتى بلغت هذه

١۔ الأدب العربى المعاصر فى مصر للدكتور شوقى ضيف ص٢٥ وفى الأدب الحديث لعمر الدسوقى ص٦٥ — ٧٠ ج١
٢۔ مقدمة العبرات للدكتور رياض قاسم

الحضارة الغربية أوجها فى سيطرة الخديويين بتقديسهم إياها وسرت فيهم فى الملبس والمأكل والمشرب والمشي وإذاذاك ضعفت جذور الثقافة الإسلامية حتى كان الصراع بينهما فى عصر "المنفلوطي" شديداً.١

فى مثل هذا الوضع المضطرب المنحل كانت مصر تتعطش إلى شخص يحولها إلى المجرى الصحيح ويدفع بقلمه الفياض التيارات الغربية التى تريد أن تقتلع جذور الثقافة الإسلامية من كافة مصر عن أهلها ويدعوهم إلى الوحدة والتضامن بقصص قصير شائق وإلى التمسك بالشعائر الدينية والوطنية بمنهج سليم فاحتل هذه المكانة المرموقة من الأدباء المصريين السيد مصطفى لطفي المنفلوطي الذى تشتمل هذه المقالة على نبذة من أحواله وخدمته الأدبية وخصائص كتابه "العبرات" كما تشتمل على انتقاله من الأسلوب العربي القديم إلى الأسلوب الأدبي الجديد.

مولد المنفلوطي ونشأته

يعتبر السيد مصطفى لطفي المنفلوطي فى طليعة المفكرين القلائل والأدباء المرموقين والأعلام البارزين الذين أسهموا فى النهضة الأدبية والإسلامية الواعية وأسسوا أسلوباً جديداً فى مجال الأدب العربي وكان واحدا بغربلة الذين نادوا ما ينقل عن الغرب والتميز بين ماينفعنا منه وما يضرنا وما نأخذ منه وما ندع، وكل ذلك فى أسلوب قصصي علمى، أدبى عصرى يفيض روعة

١ـ مقدمة فى دراسات الأدب الحديث فصل "الواضع الثقافى"

وبهاء وحيوية وحماساً ورقة وعذوبة، ويجارى مع الطبع ويصادف القلب هواه يقول الأستاذ أحمد حسن الزيات عن أسلوبه "إنما كان أسلوبه فى عصره كأسلوب ابن خلدون فى عصره بديعاً أنشأه الطبع على غيرمثال"۔ ۱

طلع نجم السيد مصطفى لطفي المنفلوطي فى بلدة منفلوط المصرية فى بيت كريم بالدين ونسب عريق وأصل إلى سلالة النبى صلى اللى عليه وسلم كان أبوه قاضياًشرعياً لبلدته ونقيباً لإشرافها وزعيماً لأسرته حفظ القرآن منذ حداثة سنه، ونسج على منوال آبائه فى الثقافة ونشأ على مطالعة الكتب فى نعومة أطفاره فلما بلغ الحادية عشرة من عمره أرسله أبوه إلى جامعة الأزهرحيث أمضى عشرسنوات ونهل خلالها من المناهل العلمية والثقافية لأدبائها ومشائخها فلم يترك ساعة يخلو فيها بنفسه إلا انصرف إلى القرأة، ولكن ميله إلى مطالعة الكتب الأدبية من نثر وشعر، فأدمن قرأة الأدب فى أمهات الكتب كالأغاني والعقد الفريد والبيان والتبيين ودواوين المنبي والبحتري وأبي تمام كما كان كثيرالمطالعة فى فحول النثر كبعدالله ابن مقفع وابن خلدون وابن الأثيروكذلك استطاع أن يمنى ذوقه الأدبي وأن يجمع ثقافة علمية أدبية أتاحت له الشهرة التى بلغها فى مجال الأدب۔ ۲

وفى رحاب الأزهروهو فى أيام الطلب وريعان الشباب لزم حلقة الشيخ الإمام محمدعبده الذى كان إمام عصره فى العلم

۱۔ الأعلام لخير الدين الزر كلى ص۲٤۰ ج۷ وتاريخ الأدب العربى لأحمد حسن الزيات
۲۔ المنفلوطى حياته و مؤلفاته ص۲٥

والإيمان وتلقى منه معظم الدروس الدينية والعلمية كمااستمتع منه إلى شروحاته العميقة لأيات من القرآن الكريم حتى كان من أقرب تلاميذه بل أوفى من أصدقائه، وبسبب من علاقته بالشيخ محمد عبده يتصل المنفلوطي بالزعيم سعد زغلول باشا وتتوطدبينها العلاقة كما توطدت علاقته السيد رشيد رضاوكان هؤلاء الثلاثة ذوي أثر قوي فى تكوين شخصية المنفلوطيوأدبه. ١

وفى سنة ١٩٠٧م لما بلغ ثلاثين ربيعاً من عمره راح المنفلوطي يكتب أسبوعياً لجريدة"المؤيد" واستمرفى ذلك طوال عامين اثنين، والناس يقبلون على قرأة مقالاتها وأقاصيصه الاجتماعية باهتمام بالغ يمثل ذلك قول أحمد حسن الزيات "إن طه مرهف أذنيه، وزناتيمسبل عينه والزيات مأخوذ بروعة الأسلوب كلهم يترقبون مؤيد الخميس ليقروا مقال المنفلوطي كما كلهم يودون أن يعقدوا أسبابهم بهذا الرجل الذى اصطفاه الله لرسالة هذاالأدب". ٢

وفى العام ١٩٠٩م اختير لوظيفة محررفى وزارة المعارف العموميةفى عهدوزارة االزعيم القوميسعد زغلول باشا ثم انتقل بعدها إلى وزارة الحقانية ثم إلى الجمعية التشريعية ثم انتهى إلى قلم السكرتارية فى الديوان الملكى وبعده إلى مجلس الشيوخ يرأس فيه طائفة من الكتاب وظل يشغل هذا المنصب ما عاش. ٣

١- مقدمة النظرات للدكتور مجيد الطراد
٢- الأدب العربى المعاصر فى مصر
٣- أيضا

أخلاقه وصفاته

كان المنفلوطي قطعة موسيقية فى ظاهره وباطنه كما قيل ١ أودع الله الحق والصداقة والعفة العفاف والجرأة فى لحمه ودمه منذ صباه، فكان مجبولاً على الغيرة الدينية والعقيدة الصحيحة كما كان دائم المترفع عن الدنايا والصغائر، دعا الناس إلى المكرمات وحثهم إلى مبادرة الخير وأشعل فى أجيالهم الشعلة الإسلامية الواعية وأكدهم على الإحسان والتعاون والعطاء وأفضى على البائسين والمستضعفين من الرجال والولدان والنساء رداء الرحمة والشفقة، كانت نفسه تتدفق بخدمة الناس وتتوقد فيها جذوة الخير صباحاً ومساءً، كان سهل الخلق لين الجانب ليس بفظ ولا غليظ، كان يحزن لسانه إلا فيما يعينه يتفقد أحوال الناس ويسأل عما فيهم لا تغضبه الدنيا ولاماكان لها، كان يتقى المجالس ويتجنب الجدل ويكره الخطابة كماكان حميم العلاقة مع عائلته شديداً على أسرته توجد هذه الصفات النيرة فى أدبه بوجه عام ومثل ذلك قوله بنفسه "حياة الكاتب بحيلة كتابته فى نفوس قرائها ولا كتابة كاتب سيعلم الناس من أمره بعد قليل أنه يكذبهم عن نفسه وعن نفوسهم ويأمرهم اليوم مما ينهاهم عنه غدا ويرى فى ساعة مالا يرى فى أخرى إنه يستبكى ولا يبكي ويسترحم ولا يرحم يخزن النفوس وهو ساكن"؟ـ ٢

١ـ وحى الرسالة مقال "المنفلوطى" ج١

٢ـ مقدمة "النظرات" ص٣٢ ج١

أدبه

إن أدب المنفلوطي يمثل المجتمع فى شعب الحياة لأن الحيلة الاجتماعية لماانحطت إلى أحط الضلالات والخرافات والنقائص المتنوعة وذابت أسس الفضيلة وانهارت دعائم الأخلاق ونقصت قيمة الثقافة الإسلامية فى نفوس المسلمين وتحولت بيوتهم إلى الحضارة الأوربية وقدزادتها الاختلافات التى تجرى فيما بينهم حيناً بعد حين سرعة فى هبوطها وشدة فى إسفافها فكتب الكاتب الذى لايزال فى شرخ الشباب قلمه يخط مقالات للجريدة "المؤيد" لينفع الناس بفكره الصحيح ويهديهم إلى المنهج السليم وينفض ازداد غبارالحضارة الغربية التى امتدت جذورها ورسخت قواعدها فى مصر من المجتمع الإسلامى كماكتب كذلك فى مقدمة "النظرات" وإن تستعرض جميع مقالاته وتراجمه وكتابه تجد كل ذلك ينحصرعلى إصلاح الحياة الاجتماعية۔ ١

دور أسلوب المنفلوطي فى النهضة الأدبية الحديثة

الكتابة فى عهده توجد فى قسمين متخالفين من النثر

القسم الأول: النثر الفني الحافل بأصباغ البديع المطبوع تزعمه عبدالله الفكري۔ ٢

والقسم الثانى: النثر المرسل يرأس به محمد عبده،

١ ـ تاريخ الأدب العربى لأحمد حسن بن الزيات
٢ ـ فى الأدب الحديث ج١ ص١٧٢

وهـذاالتيـاران الـمتـعـارضان يفترقان إلى غير لقاء فى مجال النثر العربي لهما مدرسة خاصة وأقلام خاصة، النثرالفني أصبح عبارة بالصقل والديباجة والنثر المرسل صار عبارة بالأفكار والخيالات والـكتـابة، قـداتسـمـت بـالـصبـغة اللفظية والعناية بأنواع البديع والتـكـلف فـى التعبير وتصييد شوارد الألفاظ عدم العناية المعنى بقدر عنايتهم بالشكل. ١

فـجـاء الـمـنـفـلـوطـي واسـتـفـاد منهمـا وجمع بين الأفكـار والـديبـاجة فـى مائدة واحدة وربطهما فى سلك واحد ولكل دارس لمؤلفاته يشعر بهذاالامتزاج فى كتبه، وقال محمد رجب البيومي فى كتـابـه "بيـن الأدب والـنـقـد" إن الـمـنـفلوطي هوالذى قارب بين الـجـمـال والـصحة على نسقه الفصيح فى سهولة ووضوح وسلامة مـعـنى ونغم ولايبلغ مبلغ التبرج بالصقل والزينة ولا يترك التبرج والزينة ترك المتقشف" بل أخذ من تيار مدرسة الإمام محمد عبده الاهتمام بالفكرة والاسترسال مع الحجة كما أخذ من تيار مدرسة عبـدالله فكرى جمال الصورة فى غير تقييد بالبديع ورقة العاطفة فـجـاء أسـلـوبـه نمطاً جديداً يجمع أحسن مافى التيارين من مزايا وخـصـائـص، وأصبـح زعيـم مدرسة أدبية جديدة كماكان ذا أثر قوي فى تحويل الأسلوب الأدبى القديم من تجاه إلى تجاه، فبذلك تبوأت عامة مدرسة أدبية جديدة من هذا العصر الحديث. ٢

وأول فـى أسلوبه مايلفت النظر هو ميله إلى التصوير الفني

١ ـ فى الأدب الحديث ج١ ص١٧٢
٢ـ بين الأدب والنقد ص١٥٠

وتصويره على العموم لطيف مشرق لا تقعر يستثقل فيه ولا زخرفة يستهجن ويمجها الذوق ومن أمثلة تصويره وصفه لأول شعرة بيضاء ظهرت في مفرقه قال: "رأيت الشعرة البيضاء في مفرقي فارتفعت لمرآها كأنها خيل إلى أنها سيف جرده القضاء على رأسي، فإن صورة الفنية شائعة في كل كتاباته ولعلها الأولى بين ميزاته الرئيسية لأسلوبه التى لفتت إليه أنظار الجمهرة من المتأدبين، وكذلك تشعر في أسلوبه بلباقته في استعمال الألفاظ على العموم تنبض بالحياة وأيضاً تشعر فيه بالاتزان اللطيف بين عباراته كما كان أسلوبه على انسجام في رصف الجمل يمتزج فيه الأسلوبان المطلق والمزدوج امتزاجاً، فحيناً هو أشبه شيء بإنشاء عبدالله بن المقفع كما أشبه حينا بابن الرومي من الشعر ١ ويوجد في أسلوبه أيضاً الترسل ولكنه ليس كترسل ابن خلدون بل ذلك الترسل الأدبي الذي لايعمد فيه إلى السجع إلا نادراً وبدون تكلف وكما كان كثيراً ما يستخدم المألوف الشائع من المجازات حتى المتداول على ألسنة العامة وقد يصوغه صياغة جديدة.

فالخلاصة أن المنفلوطي قد أجاد الصناعة الكتابية وطبعها بطابع الأناقة المستملحة فهز جيله وترك لسائر الأجيال أثراً أدبياً لايزال حتى الآن محط أنظار المتأدبين والطلاب وبمناسبة هذا أقدم أمامكم عبارة الأديب أحمد حسن الزيات التي كتبها في كتابه بعد ما تأثر أسلوبه دليلاً "أشرق أسلوب المنفلوطي على وجه

١ الفنون الأدبية وأعلامها ص٢٩٣

"المؤيد" إشراق البشاشة وسطع فى أندية الأدب سطوع العبير، ورن فى أسماع الأدباء رنين النغم ورأى القراء والأدباء فى هذا الفن الجديد مالم يروا فى فقرات الجاحظ وسجعات البديع ومالا يرون فى غثاثة الصحافة، وركاكة الترجمة فأقبلوا عليه إقبال اليهم على المورد۔ ۱

مكانته الأدبية

احتلت روايات المنفلوطي وكتبه الأدبية مكاناً بارزاً فى مجال الأدب واللغة وحظيت لدى الأدباء والبلغاء والشادين فى الأدب حتى عامة الناس بالقبول ونالت تقديراً عظيماً فى البيئات العربية الإسلامية وانتشرت فى كل قطر من أقطار العالم ودخلت إلى كل بيت وطبعت مرات متعددة وتهافت الناس من كل الأعمار والأجناس على قرائتها ودراستها، ولكن صاحبها لم يسلم من ألسنة النقاد وأقلامهم وهذا شأن جميع الكبار فى ميادين الأدب والسياسة والفن وغيرها۔

ومن الناس من يقول إن أدب المنفلوطي أدب عصر لاأدب لغة عريقة، ومنهم من يقول إن المنفلوطي ليس بذي رأى خاص، وكذلك يقال إن صاحب العبرات ضعف الأداة وضيق الثقافة، فإني أقول لك أيها القارئ الكريم إنك تنشر كنانة أدب المنفلوطي وتعجم عيدانه عوداً عوداً وتقرأ كتبه ورقاً ورقاً وتسبر غورها فلا تجد شيئاً من تلك الاعتراضات المذكورة بل تجد فى أدبه الرائع

۱۔ وحى الرسالة لأحمد حسن الزيات ج۱ مقال "المنفلوطى"

أن المنفلوطي احتل مكانة الصدارة فى رأيه الخاص هو رأى الإسلام وفكره الديني أنه ما كتب مقالاته الخالدة وما ترجم القصص الشائعة إلا روح الإسلام تخفق فى حناياه وتأتلق فى عينه، ولذلك كتب محمد رجب البيومي فى كتابه "النهضة الإسلامية " كان المنفلوطي فى اجتماعاته أديباً إسلامياً يعبر عن رسالة السماء بما أنزلت من قرآن وما ألهمت من أقوال نبي وأفعال سلف ومآثر خلف ومازال الشباب يجدون فى كتبه ما يغذى عواطفهم ويروي مشاعرهم الصادية ١ "وكذلك تجد فى كتبه أكبر الأدلة فى بقاء أدبه وخلوده لأنها غذاء لكل أديب وناثر ويحتاج إليها المشتغلون فى الأدب فى كل عصر ومكان وأنها بعد وفاتة طبعت مرات تتجاوز العشرين والثلاثين فى أكثرها وتجد أيضاً خواطر إنسانية لا يتضاءل بريقها من جيل إلى جيل، وهي وحدها التي تضمن لأدبه سبيل البقاء ٢ " وإن تسلم لم يكن عالماً باللغة فإن ذلك لم يمنعه من أن يكون بصيراً بما يستعمل من ألفاظها، وأما ضعف الأداة وضيق الثقافة التي تتوجد فى شخصية المنفلوطي فهذا النقد تجن سافر، لأن من دراسة كتب المنفلوطي وروياته وأقاصيصه يظهر أنه قوي الأداة فصيح اللغة واسع الثقافة إن لم يحصل بالعلوم الغربية، ولكن يعرف تماماً الفرق بين ثقافتها الصحيحة من الثقافة الدنيئة،وتحمل كتبه"النظرات" و "العبرات" وغيرها واسع الثقافة قوي الأداة، وتشتمل على عدة

١۔ لنهضة الإسلامية فى سير أعلامها المعاصرين ص١٧٢

٢۔ مقدمه "النظريات" للدكتور مجيد الطراد، والدكتور رياض قلم

موضوعات ويتهافت إليها الناس فى كل عصر ويحن إلى قرأتها الأدباء الملموسون فى كل دور فهذه الخصائص التي تخلد صاحبها فى العام والخاص ما دامت السماوات والأرض۔

آثار المنفلوطى الأدبية المنشورة

من آثاره الأدبية "النظرات" وهو مجموعة رسائل كان يكتبها فى جريدة "المؤيد" وغيرها من الصحف المصرية والكتاب يشتمل على ثلاثة أجزاء ظهرت طبعته الأولى فى عام ۱۹۱۰م۔

كتاب "العبرات" وهو مجموعة من القصص بعضها معرب و بعضها الآخر موضوع۔

رواية "فى سبيل التاج" وهى معربة عن الفرنسى فرانسوكوبيه۔

رواية "الشاعر" وهى مترجمة عن الفرنسية للأديب الفرنسى أدبون روستان۔

رواية "الفضيلة" وهى مترجمة عن الفرنسية للأديب برناردان سان بيار۔

رواية "ماجدولين" وهى مترجمة عن الفرنسية للأديب "الفرنسي الفونس كار" وهى مختارات شعرية و نثرية انتقاها من أدب الأدباء العربى فى مختلف العصور ۔ ۱

فكل هذه الروايات والكتب طبعت غير مرة، ونالت من الشهرة والذيوع فى جميع أقطار البلاد العربية فى العشرينيات من

۱۔ مقدمة "العبرات" للدكتور رياض قاسم

هـذا الـعـصـر مـالـم يـنـلـه إلا القليل انتشرت فى أكثر أقطار العالم الـعـربـى ودخـلـت إلى خدور النساء فى المجتمع العربى من التفات المرأة العربية مالم تنله روايات أى مؤلف عربى آخر۔ ١

وفاته

لـم يـعـمـر الـمـنفلوطى طويلاً فقد وافته المنية يوم الخميس الـواقـع فـى ١٢ حـزيـران ١٩٢٤م (١٠/ذوالحجة ١٣٤٢) يوم جرت فيه محاولة اغتيال الزعيم الوطني سعد زغلول۔

١۔ نشأة النثر الحديث وتطوره باب "أدب المنفلوطى

الفصل الثاني

خصائص "العبرات"

نافذة عامة على "العبرات"

قد عالج المنفلوطي فى كتابه "العبرات" شؤونا اجتماعية وأدبية تغلب عليها الصبغة الأخلاقية ويجنح فى أكثر مقالاته إلى الإسلوب القصصي ولا بد من الإشارة إلى أن مقالاته هذه قد دخلت إلى خدور النساء فى المجتمع العربي، ونالت التفات المرأة العربية حتى قالت إمرأة عربية. ١ ليس من شك أن كتابه "العبرات" كان ذا أثر كبير فى تهذيب لغة الناشئين وكتابتهم وترقية أساليب الكتابة فى مطلع القرن العشرين وقد شهد بذلك معاصروه ، فقد نصح أحمد لطفي السيد للشبان أن يجعلوا عبرات السيد المنفلوطي فى مطالعتهم، ونصح للناشئة أيضاً أن يحفظوا منه ما استطاعوا فإن هذا الكتاب خيرمرب لملكة الإنشاء وكان أثر هذا الكتاب على طلبة الأدب قوياً بحيث حاول البعض تقليده فى الكتابة . ٢

إن "العبرات" هو مجموعة مقالات المنفلوطي بعضها موضوعة وبعضها مترجمة، وكلها مآسي وهي من أبلغ ماكتب من حيث الديباجة والإنشاء يقع فى جزء واحد على ثماني قصص، أربع منها موضوع وأخرى مترجمة. ٣

---

١. المنفلوطى حياته ومؤلفاته ص٢٦
٢. بين الأدب والنقد لرجب البيومى ص١٥٦
٣. العبرات دراسة وتقديم للدكتور رياض قاسم ص٢٠٥

خصائص "العبرات" العامة

إن العبرات ينفرد بخصائص بارزة تميزه من بين مؤلفاف عصره بكل وضوح، إنه لايزال يؤثر فى قلوب الجيل الجديد وعقوله رغم ما مضت عليه مدة طويلة، وحدثت فى خلالها ثورات فى دنيا الأدب واللغة وقد أتيح ذلك أنه ينال الإعجاب والقبول من جديد فى هذا العصر الولوع بالتجديد وهنالك بعض جوانب ذات أهمية فى هذه الخصائص.

وكل دارس لهذا الكتاب يشعر خلال دراسته له بشفافية الروح الدينية المزوجة بكتابات المنفلوطي هذه الشائقة الرصينة فإن المنفلوطي يركز فكره فى كل قصص على المنهج السليم الصحيح الذي يدعوإليه الإسلام بحيث يشفي العليل، ويروي الغليل ويبعث الطمأنينة واليقين فى النفس، ويكتب جميع قصصه بأسلوب أدبي يحمل فكراً إسلامياً، ولذلك تجد أن العبرات يفيض حيوية باسمة تملأ الحياة سروراً وحبوراً ويثقف اللسان ويهذبه ويعالج قضايا متعددة الجوانب فى معترك الحياة وأوساط العامة، وكذلك إن من يدرسه يستطيع أن يعين ويقدرالعصر الذي ألف فيه هذا الكتاب بسهولة عقلية المجتمع وأخلاقه الذي كان يتصل به المؤلف. ١

ويبدو أيضاً أن مؤلفه صاحب عقل وواع وقلب حساس ومشاعر حية قوية ولم يكن مجرد آلة للكتابة ولا محض عقل، وكذلك يمتاز بين الكتب واللغة بخلوه من الجفاف والتعقيد بل

١ـ مقدمة العبرات للدكتور رياض قاسم

يتسم بالسلامة والقوة والعربية الخالصة وأحياناً بصفة البلاغة والأدب والخطابة من غير قصد وتلك التي تجعل هذا الكتاب ذات روعة وحيوية وقوة، فإذا تجلد الطالب الصادق ودأب على الغوص فى بحر "العبرات" فلا شك أنه يرجع من بدرر ثمينة ولآلي فاخرة من الأدب واللغه والبيان والبلاغة والمعرفة كما يبدو أيضاً بعد دراسته أن صاحبه قد تحرر تحرراً تاماً من القيود اللفظية فى كتابات عصره واهتم اهتماماً بالغاً بالمعاني فى السامية والأهداف العظيمة فى إيراده هذه القصص الإنسانيةالمؤثرة ولم يبغ من كتابه هذا إلا خير الأمة وسعادتها ورأب الصدع من بنيانها ورتق ماتفتق من إزارها وبترما استعصى علاجه من أعضائها۔

من أجل هذا راج كتابه "العبرات" وانتشر وذاعت شهرته فى جميع الأمصار الإسلامية لأنه كان وسيبقى متعة للعقل والنفس والقلب والذوق ولأنه كان وسيبقى غذاء لكل أديب وناثر وهو إلى ذلك كتاب ممتع يشهد لمؤلفه بالفطنة والذكاء وطول الباع فى الفنون الجليلة التي عالجها وقوة التمكن فى اللغة العربية وآدابها، وينطق بماله من كثرة الاطلاع على دقيقها وجليلها۔

وعلى كل فقد كان "العبرات" واسع الانتشار فى العواصم العربية والأوساط الأدبية وتناولته طبقات الأمة بالمطالعة والدراسة وسوف كان يشير المربون والمعلمون والمشتغلون فى الأدب واللغة على الشباب والأجيال القادمة بمطالعة هذا الكتاب مابقيت السماوات والأرض ١

١۔ نشأة النثر الحديث وتطوره لمعمر الدسوقى مقال "المنفلوطى"

أسلوب "العبرات"

ولقد جمع العبرات بين غزارة المعنى ورصانة اللفظ وفصاحته واشتمل على نواح فكرية ونفسية عاطفية مختلفة من وصف وتصوير صادق للخواطر والمجتمع الذى كان فى غاية الإسفاف والانحطاط والمصاب بالأفكار الغربية ففى هذا الكتاب نقد صريح لاذع للحضارة الغربية مع إلقاء الضوء على الأوضاع المصرية بطريقة أدبية، فكان هذا مادة غزيرة وينبوعاً عذباً للأدب وثروة قيمة للأخلاق كما اشتملت عباراته على أصناف أدبية عديدة من تمثيلات بارعة وحكم عالية وأمثال رائعة، ولذا من يقرأ "العبرات" يشعر بالحسرة والألم على ما مرعلى "الأندلس" من أحداث ووقائع، وحيناً يشعر بالسرور والغبطة على ما بلغه من معلومات الأدب واللغة وفى الوقت نفسه يشعر بأنه فى حاجة إلى قرأته مرات وكرات.

ميزة "العبرات" الأدبية

لقد كان من أخص الخصائص "للعبرات" القدرة الفائقة على التعبير عن القصص المنقولة من اللغة الأخرى فى أحسن تعبير للقراء حيث لايعلمون أنها هي المنقولة من اللغة الأخرى أوالمترجمة من القصص الفرنسية بل يفهمون أنها من أصالة فى الكتاب، وإن براعة التصوير للأخيلة فيه بطريقة طبيعة أدبية بليغة ممايدل على بقاء صاحب هذا الكتاب وخلوده فى الأجيال القادمة على طول الخط، وكذلك من أهم ميزته البارزة فى

"العبرات" كله هي الفهم العميق للروح الإسلامية فى محيطها الشامل وهو لهذا لا يعد نموذجاً للأدب واللغة بل نموذجاً للحياة الاجتماعية النقية القائمه على أساس العدل والرحمة والقناعة والتعاون فيما بينهم۔

"العبرات" من الناحية الإنشائية

بما كان المنفلوطي من الجيل الثاني من أصحاب المقالات ١ فحرر الأدب من التعقيد والتنميق والتحذلق والصياغة اللفظية، واعتمد فى أدبه الإنشائي على موهبته وماطبع عليه فأرسل النثر، فصار "العبرات" بداية الأدب الإنشائي المحبوك، وقد كتب فى "كيف أكتب رسائلي" أن الأدب هو وسيلة مفضلة للحديث مع الجماهير فلاتكلف فى اللفظ لايتطلبه المعنى ولا تفتيش عن معنى لا يقتضيه اللفظ ٢ فميزة "العبرات" من الناحية الإنشائية على حد قول بعض الأدباء المعاصرين ، إنه يجمع بين الأصالة والمعاصرة، وفيه محافظة من حيث اتخاذ القديم والجديد مثلاً أعلى فى صياغة۔

فتهافت القراء على "العبرات" وأولع الطلاب به لإنشاء أدبه، واعتمدواعليه فى إقام عوج كتابتهم،وتأثر به الأدباء لا سيما كتاب الرواية من هذه الناحية ونصحوا للمتأدبين لقرء اته والورود على منهله۔

"العبرات" فى ضوء قصصه الموضوعة

إذا ذهبنا لنحلل قصص "العبرات" الموضوعة فرأينا

١ـ المفصل فى تاريخ الأدب العربى، للمؤلفين ص٢٠٦
٢ـ أيضا ٢٠٤

أن القصص الموضوعة تختلف عن المترجمة تارة، وتنسجم معها أخرى، فإذا لم يكن المنفلوطي قاصاً بارعاً فتفقد قصص "العبرات" الموضوعة المقومات الفنية والعناصر القصصية، ويظهر فيها فقدان المراعلة القصصية، ومعظمها مطبوعة بالطابع الإرشادي والوعظ والمناظرة، دون أن يتغلغل المنفلوطي فيها إلى الصورة المعنوية" ١ لكنه أجاد فيها حيث خلع عليها إهاباً من أسلوبه وأدبه، فالأسلوب وعرض الواقع والتجاوب مع الجماهير المظلومين كل هذا جذب القراء إليه۔

"العبرات" فى ضوء قصصه المترجمة

أما "العبرات" من ناحية الترجمة والتعريب، فإن المنفلوطي لم يكن يتقيد بنص الأصل بل كان يخلع على القصة ثوب الصياغة الجميلة الطريفة، ويكتبها بأسلوب رشيق شفاف كأنما هو مؤلف ثان للكتاب، فقد ألهب بهذه الترجمة العاطفية خيال الشباب وأثار أحلامهم،وزعم أن هذا التعريب قد أثار ضجة كبيرة لدى أوساط الأدباء والمعربين والنقاد، لكن لا ينكر أحد رواج وقبول هذا التعريب ومدى أثره على الطبقات المترجمة، فقلد المنفلوطي الجيل المتأثر بترجمته فى ترجمة قصصهم ۔ ٢

الفكرة الإسلامية فى "العبرات"

من أهم هذه الخصائص أن "العبرات" يزخر بفكرة إسلامية رائعة بديعة ولذا قد حلى مؤلفه جيده "بقصة اليتيم"

١۔ دراسة "العبرات" للدكتور رياض قاسم ص١٠٢
٢۔ بين الأدب والنقد للدكتور رجب البيومى ص٥٣

ليعلم القارئ أن صاحبه دعاالناس بهذه القصة إلى التعاون على اليتامى والمساكين والغرباء والذين لايملكون أمرهم وهذا هوالتعليم الذى علمنا محمد ن العربي صلى الله عليه وسلم بهذا الحديث، أنا وكافل اليتيم هكذا وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما (رواه البخاري فى كتابه).

الفكرة الاجتماعية فى "العبرات"

أظهر صاحب العبرات فى الكتاب هذا اعتقاده بأن فلاح الحياة الاجتماعيه لايمكن بدون شريعة الإسلام لأن الحياة الاجتماعية التي تعدل عنها أصبحت فاسدة ودماراً ومصابة بالانحلال الخلقي والانحطاط الذهني حيث يستبد الأمراء والحكام على الناس استبداداً شديداً ويعيثون فى البلاد على حساب الدماء والأموال والأعراض، ويتصام أهل الحل والعقد عن شكوى الضعفاء والمستغيشين حتى كانت الأرض كفة حابل لايدري الضعيف حتى يغتال وأين ينهب وكانوا يتخطفون من بين عشيرتهم إلى حتى صار أكثر الناس يقومون أنفسهم بالأعمال الجريمة ويرتكبون الأفعال البشعة لأنهم لا يجدون من يجيب إلى إغاثتهم ويعينهم على نوائبهم ويعطيهم حقهم من القوى.

وهذه هي الحيلة الاجتماعية تتوجد فى عصره بدون شريعة الإسلام ولذا صاحب العبرات استرعى التفات الناس إلى العدل والرحمة بعد ماكتب قصة "الهاوية" و "الجزاء" الأدبية لكي تضطر الحياة الاجتماعية للناس إلى أن تخرج من الرزائل إلى

فضائل الإسلام ولكي يعيش الناس عيشة راضية طيبة وينالوا حقهم فى مجتمعاتهم وإدارت أمرائهم، وهذا لايمكن إلا بشريعة الإسلام.

الفكرة الاقتصادية فى "العبرات"

إذا فتحنا النافذة الاقتصادية من "العبرات" فرأينا أن "العبرات" يلم بهذه الناحية إلما ماً لا بأس به، لا سيما قصتي "الضحية" و "مذكرات مرغريت" تتمركزان على الاهتمام بهذا الجانب، حيث أشار صاحب "العبرات" إلى أن الإسراف والإنفاق فى سبيل اللذة والشهوات كيف يؤديان إلى الفقر والعوز، ويسببان القلق الفكري والذهني، وأن ال شجع الزائد فى الا رتزاق والاكتساب يجلب الهم والحزن والحرمان والشقاق.

فيدعوا المنفلوطيفى "العبرات" إلى الاتزان فى الإنفاق ومراعلة الصحة فى الاكتساب وعدم الانسياق وراء اللذة والشهوات وأن لايندفع الناس وراء حياة الترف والدعة، ومحاكلة الأجانب من الغرب فى الحياة والمعيشة التي تؤدي إلى الإنفاق الباهظ، ويلجأ أصحاب السياسة إلى فرض الإتاوات والضرائب الزائدة على الجماهير والشعب وأصحاب التجارة والصناعة، فيرى المنفلوطي فى قصصه فى "العبرات" أن الفلسفة الاقتصادية الإسلامية هي الجادة الوحيدة لإنقاذ البشرية من ضنك المعيشة والفقر المدقع.

استعراض قصة "الحجاب" في سطور

كان في مصر في عصر صاحب العبرات طائفتان

طائفة تدعو إلى المرأة إلى السفور وتزعم أن الحجاب هو عائق لمسايرتهامع الزمن وسالب لحريتها الذاتية و "طائفة أخرى" تقول إن الحجاب ضرورة المرأة وهو طابع الأمة الإسلامية ومنهم صاحب العبرات وكان الصراع بينهما شديداً.

فكتب المنفلوطي في كتابه "العبرات" قصة أدبية تدور حول الحجاب والسفور وبدأ هذا القصة.

"ذهب فلان إلى أوربا وما ننكر من أمره شيئاًفلبث فيها بضع سنوات ثم عاد ما وبقي مما كنا نعرفه منه شيء".

ووصف صاحبه شرور السفور وصفا بارعاًحتى يستسلم قارئ هذه القصة أن المرأة التي ترتدى الحجاب وتلبس البرقع والنقاب تكون في أمن من الزلل والسقوط والانحدار بحيث لم يشعر بأن عقيدة المؤلف يسرى في جسمه شيئاً فشيئاً كما يعتقدأن المرأة التي تتنازل عنها تصاب بالسرطان الخلقيوتتأكل الأرضةوقتاًبعد وقت حتى يكون مجوفاً نخباً هواء وكما علم صديق صاحب "العبرات" هوالذى ألقي إمرأته إلى التهلكة بخلعه الحجاب عن وجهها

خلاصة القول حاول صاحب العبرات بهذه القصة إزالة سوء التفاهم للدعاة الذين يدعون أن الحجاب هو صد كبير

لتقدم النساء إلى مجالات الحياة بل أشار بها إلى أن النساء فى العهد النبوي الشريف كن يقمن بعملية الطب والتعليم وإغاثة المرضى والجرحى وإعانة الفقراء والمحتاجين فى ميدان الحياة حتى كانت لتجارة السيدة خديجة رضى الله عنها جولة وصولة، وكانت السيد رفيدة رضي الله عنها برعت فى الطب وأنها تداوي سعد بن معاذ رضى الله عنه بعد الخندق بيد أنها كانت محتجية حجاباً تاماً ومرتدية ملابس طويلة لايبين لها غير الوجه۔

خلاصة البحث

قد قطعنا المفازة بفضل الله وبعونه الذي لولاه لماستطعت على إكمال هذا البحث.

فالحالة المصرية من الناحية السياسية والاجتماعية والاقتصادية مذكورة فى بداية هذا البحث، وإن حياة المنفلوطي أيضاً قد أطلتها إلى حد،لكن الفصل الذي استرعى مني الاهتمام البالغ هوالفصل الثاني الذي قد خصصته لبيان وتحليل "العبرات"، موضوعاً وغرضاً وأدباً واجتماعاً واقتصاداً.

ولا شك أن المنفلوطي قد فاز بالقدح المعلى من بين الكتاب والمعربين فى الفصاحة والبلاغة والتعريب والترجمة والسيطرة على النزعة النفسية الشعبية، وإبراز الحقائق الجيدة والسيئة كليهما من المجتمع المعاش، وبيان ضعف السياسية والدعوة إلى ترسيخ قواعد الحكومة العادلة، وإلى إنشاء الأدب الإنشائي النزيه ذي غرض وموضوعية وفكرة إيجابية بناء ة لترشيد المجتمع إلى الأمن والسعادة، والأدب إلى الموضوعية والنزاهة.

فعلينا أن نهتم بهذا الجانب الذي دعا إليه المنفلوطي فى صورة كتابه "العبرات" ونستعمل الأدب كأداة مفضلة للغاية العظمى التي هي ميزة كبرى للأدب الإسلامي، ونلبي دعوة "رابطة الأدب الإسلامي العالمية" فى توجيه الأدب إلى الغاية السامية، ونتوجه إلى تلك الجوانب الضعيفة من المجتمع الإسلامي ونحاول القضاء عليها.

رابطۂ ادب اسلامی

حلیم صابر

مثل خورشید درخشاں ادب اسلامی
ہے زمانے میں نمایاں ادب اسلامی

حسن الفاظ و معانی کی بدولت ہے یہ
وجہ تسکین دل و جاں ادب اسلامی

بیل بوٹے ہیں کھلے اس میں ادب پاروں کے
فکر و فن کا ہے گلستاں ادب اسلامی

کیوں نہ پھیلائے یہ پاکیزہ ادب کی خوشبو
جب ہے تہذیب بداماں ادب اسلامی

ہے ضیاء بار عقیدت کے جلو کھانے میں
صورت مشعل ایماں ادب اسلامی

تشنگان ادب و علم کے حق میں ہے یہ
مثل سرچشمۂ عرفاں ادب اسلامی

ہے بلاشبہ مکتب عالم کے لئے
درس و تدریس کا ساماں ادب اسلامی

پیش کرتے ہیں زمانے میں بشکل ادب اسلامی
ماہر علم سخن داں ادب اسلامی

قلمی تحریک سے دنیائے ادب میں صابر
پھیر دے گا رخ دوراں ادب اسلامی